ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اگست ۲۰۱۷ء

www.nadwifoundationaligarh.org

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	خدافراموشی دراصل خودفراموشی ہے	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	یہی زمیں ترا مسکن یہی ترا مدفن	مدیر	۳
		نظر میں شعلگیٔ لاالہ پیدا کر		۷
۳۔	پیام سیرت	تیرے لئے قربان ہیں سب رشتے ناطے	محمد فرید حبیب ندوی	۱۳
۴۔	تعارف و تبصرہ	''تحریر بے عدیل'' پیمانۂ احتساب ہے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۱۶
	قضیۂ فلسطین	بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے حقائق	مجیب الرحمٰن عتیق ندوی	۲۸
	// //	لالۂ خونیں کفن، فلسطین اردو شاعری	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۳۷
	// //	نظریۂ تقریب ادیان اور مسجد اقصیٰ	محمد فرید حبیب ندوی	۴۰
	// //	مسجد اقصیٰ سے متعلق چالیس حقائق	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۳
۶۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد-چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۴
۷۔	تحریک آزادی	آزادیٔ ہند میں مسلمانوں کا کردار	محمد قمر الزماں ندوی	۵۹
۸۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۱۸)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۶۱
۱۴۔	آخری صفحہ	سلام اس پر کہ جس نے عورتوں کی دستگیری کی	م۔ق۔ن	۶۴
۱۵۔	شعروادب	پھولوں کو دیکھ کانٹوں میں ہنس ہنس کے گذارا کرتے ہیں	قمر جلالوی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

یہی زمیں ترا مسکن ہے یہی ترا مدفن

ہمیں بہت شدت کے ساتھ یہ احساس ہو رہا ہے کہ فی الوقت حکومت کے تیور بڑے جارحانہ ہیں، اگر چہ اب تک دوغلی پالیسیاں ہی جاری ہیں، لیکن کربناک واقعات کے تسلسل اور شاہی فرامین کے سبب لوگوں میں خوف و ہراس ہے، آنکھوں کو پڑھیے تو خوف نظر آئے گا، چہرے کو پڑھیے تو بے چینی اور کس مپرسی کی سطریں نظر آئیں گی، پیشانی کی سلوٹوں میں عدم تحفظ، اضطراب اور مستقبل کے اندیشے صاف نظر آئیں گے، اگر صحیح بات کہی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت اچھے اچھے لوگ حواس باختہ ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ کیا کریں اور کہاں جائیں۔

نہیں جانتے کچھ کہ جانا کہاں ہے
چلے جا رہے ہیں مگر جانے والے

حکومت مرکزی ہو یا اتر پردیش کی وہ ہندستان پر قابض ہونے کے نت نئے طریقے اپنا رہی ہے، یہ بات یاد رکھیے کہ وہ اس کو ہندو راشٹر نہیں بنا سکتے، ہرگز نہیں بنا سکتے، (اس پر میں کئی بار اظہار خیال کر چکا ہوں کہ کیوں نہیں بنا سکتے) مگر اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ننگا ناچ ضرور ناچ سکتے ہیں کہ اس ملک پر تنہا ایک ہی پارٹی کا راج ہو، ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ ممکن ہے وہ جمہوریت کو فاشزم کے پردے میں ڈھانپ دیں اور سنگل پارٹی رول (Single Party Rule) کے لیے صدارتی نظام نافذ کریں، کسی حد تک یہ چیز مسلمانوں کے لیے پریشانی کا باعث ضرور بن سکتی ہے، لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں البتہ مسلمانوں کو پورے ایمان و یقین کے ساتھ حکمت عملی بنانے کی ضرورت ہے اور حالات کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے حکیم مشرق نے کہا تھا۔

اگر چہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

اور کہا تھا۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا ہے غارت گر باطل تو

صورت حال تو یہ ہے کہ نائب صدر جمہور یہ حامد انصاری کو بھی وقت رخصت اس حکومت نے اور اس کے پھونپو میڈیا نے نہیں بخشا، ان کا جرم بس اتنا تھا کہ انھوں نے اپنی الوداعی تقریب کی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ مسلم کمیونٹی عدم تحفظ کے احساس

سے دوچار ہے، اس پر جو ہائے واویلا مچائی گئی اور جس طرح پھر ان پر طنز و تشنیع کے تیر چلانے گئے، الامان والحفیظ، اپنے بھی کہنے لگے کہ اب وقت رخصت کیا ضرورت تھی اس بیان کی، دس سال میں انھوں نے کیا کیا، جو انھوں نے کیا وہ لوگوں کو معلوم نہیں اور جو لوگ کروانا چاہتے تھے وہ کرنے کی پوزیشن میں وہ کبھی رہے نہیں، لوگ تو بے چارے اس قدر نادان و ناواقف ہیں کہ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ حامد انصاری اس سے پہلے بھی یہ باتیں کہہ چکے ہیں، دوسو سے زائد مواقع پر وہ اپنی تشویش کا اظہار کرتے رہے ہیں، حکومت وقت نے ان کے بیان پر جو رویہ اپنایا وہ بالکل بھی قابل تعجب نہیں اس لیے کہ وہ کانگریسی بھی تھے اور مسلمان بھی۔

بہار کے انتخابات کے بعد میں نے لکھا کہ وہاں جمہوریت فتحیاب ہوئی لیکن سیاست کی بساط پر کھرے اور کھوٹے کی پہچان عمر بھر کے تجربہ کے بعد بھی بہت مشکل ہے، پھر تو میری کیا حیثیت، آپ ہی دیکھیے جس ملائم کو لوگ ''ملا'' کہتے رہے شنید ہے کہ بھاجپا انھیں بہار کا گورنر بنا رہی ہے، بہر حال بی جے پی نے بہار میں بھی سیکولرزم کو مات دے کر اپنے ارادہ کا اظہار کر دیا ہے۔

مہاراشٹر کارپوریشن میں تجویز آئی ہے کہ تمام اسکولوں میں وندے ماترم کو نافذ العمل کیا جائے، ادھر اتر پردیش کے مدرسہ ایجوکیشنل بورڈ نے بھی سرکولر جاری کرتے ہوئے کہا ہے کہ تمام مدارس میں قومی ترانہ گایا جائے اور پروگرام کی ویڈیو گرافی کرائی جائے، یعنی عین اس وقت جب پورا ملک آزادی کے جشن میں نہایا ہوا ہو، ہر طرف آزادی کے تذکرے ہوں تو ان مولویوں کو اپنی دیش بھکتی اور اپنی حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ تیار کرنے کا حکم دے دیا گیا اور دیا بھی اس طبقہ کے لوگوں نے جن کی نمائندہ تنظیم کے صدر دفتر پر کبھی ترنگا نہیں لہرایا گیا، قتل و غارت گری، از دحامی تشدد (Mob lynching) کے ساتھ اس طرح کی ٹارچر کرنے والی پالیسیوں سے قطعاً گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اپنا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے اور خطرات سے نمٹنے کے لیے حکمت عملی بنانے کی ضرورت ہے، جو کام ہم نے اب تک نہیں کیے ہیں فوری طور پر انھیں انجام دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم اپنی تاریخ سے واقف ہیں؟ کیا ہم مجاہدین آزادی کے نمایاں ناموں سے واقف ہیں، کیا ہم کو یہ معلوم ہے کہ تحریک آزادی کی ابتدا ہمارے اسلاف نے کی، ہم ہی نے آزادی کے ہر خاکے میں رنگ بھرا، ہم ہی از اول تا آخر اس کی قیادت کرتے رہے، ہم ہی سے جہاد آزادی کے لیے آتش شوق بھڑکتی تھی، ہم ہی تھے جو حب الوطنی کی چنگاری کو شعلہ بناتے تھے، ہمارے دم سے ہی تحریک آزادی میں جان تھی، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کو بھی اپنی تاریخ نہیں معلوم، جس کے نتیجہ میں وہ دفاع کے لیے فوراً تیار ہو جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ ''ہم بھی شریک تھے''، ''ہمارا بھی حصہ ہے''، جبکہ ہماری طرف سے پوری قوت کے ساتھ یہ بات ہونی چاہیے کہ ہم ہی تھے جو کچھ تھے، آپ نے بھی شرکت کی، یہ کوئی متعصّبانہ دعویٰ نہیں بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جن کے شواہد کتابوں میں موجود ہیں، سوال یہ ہے کہ جب ہم اپنی تاریخ سے واقف نہیں، آزادی کے لئے نبرد آزمائی کے دوران اٹھنے والی تحریکات اور بے شمار علماء و دانشوران کی قربانیوں سے واقف نہیں تو پھر اس میں کسی کا کیا قصور، ہم نے کبھی یہ تجزیہ کیا ہی نہیں کہ ہم نے آزادی کے بعد کیا کھویا کیا پایا، اور کیا بھی تو بس نشستن گفتن برخاستن کی حد تک تو پھر ان حالات کے پیش آنے پر تعجب کیوں؟

اب وقت آ گیا ہے کہ تجزیہ کیا جائے اور طوق غلامی کو اتار پھینکنے کے لیے بغاوت کی جائے، نئے صبح وشام پیدا کرنے کی حکمت عملی تیار کی جائے، خاموشی کے ساتھ تعلیمی تحریک کو آگے بڑھایا جائے، سیاسی شعور کی تربیت کی جائے، مسلمان سب مل کر اپنا ایک ایسا نمائندہ تھنک ٹینک قائم کریں جس میں دین ودنیا کے واقف کاروں اور دونوں کا لحاظ کرنے والوں کی مناسب نمائندگی ہو اور اس کی پالیسیوں کے مطابق مسلمانوں کی مختلف میدانوں میں منتشر کوششوں کو باہم مربوط کر دیا جائے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تاریخ سے واقف کرانے کی ہر ممکن کوشش کریں، اپنا لٹریچر شائع کریں، مختلف زبانوں میں کتابچے تقسیم کریں، ہم وطنوں کے ساتھ اسٹیج شیئر کریں، جنون کی حد تک محنت کی ضرورت ہے، ہر سطح پر وسیع الفکری کے ساتھ کام کی ضرورت ہے، حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں اور جس طرح آنکھیں دکھا رہے ہیں، ان کے مقابلے کے لئے ہمیں سنبھلنے کی ضرورت ہے **مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ آج بھی ہم جماعت جماعت، جمیعت جمیعت اور تنظیم تنظیم، گروپ گروپ کے کھیل میں مشغول ہیں، کوئی کسی کے ساتھ مل بیٹھنے اور حکمت عملی تیار کرنے پر آمادہ نہیں**، برما کے مسلمانوں کو مولانا علی میاں کی نصیحت ہمارے سامنے ہے اور اہل برما کے موجودہ حالات بھی، ترکی کے پچھلے دور کے علماء کی بے بصیرتی بھی ہمارے سامنے ہے اور **عہد مغلیہ میں کی گئی غلطیاں بھی تاریخ کا حصہ ہیں، پھر بھی افتراق وانتشار اور اپنے خول سے باہر نہ نکلنے کا کھیل جاری ہے، انا کی خاطر بڑی بڑی تنظیموں کو تقسیم کر دیا جاتا ہے، پسِ منظر کچھ ہوتا ہے اور پیش منظر کچھ اور بتا دیا جاتا ہے، خاندانی اجارہ، موروثی سلسلہ اور بے بصیرتی ہم سے اس طرح چمٹ گئی ہے کہ اس پر آشوب وقت میں بھی ہم اپنی روش پر قائم اور چھوٹے چھوٹے داخلی مسائل میں منتشر ہیں اور فاشزم ہماری چوکھٹ پر اپنی بھیانک شکل میں دانت پھاڑے کھڑا ہے، مگر کچھ لوگ انا کی تسکین کے لیے کوشاں ہیں، کچھ اپنوں کی تائید وتردید کے پلان میں مشغول، کچھ کو گوشۂ عافیت کے باہر کے حالات سے کوئی واسطہ نہیں اور کچھ پوری بے فکری کے ساتھ اپنی ہی دنیا میں مست ومگن۔**

ہم بار بار کہتے آئے ہیں کہ ہمارا مسئلہ ان پڑھ اور گنوار نہیں ہمارا مسئلہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، جن کے ذمہ قوم کی قیادت ہے، خواہ وہ علماء کا طبقہ ہو یا دانشوروں کا، جب تک یہ دونوں مل کر نہیں بیٹھیں گے، جب تک مفادات سے بالا ہو کر سوچنے کی عادت نہیں پڑے گی، جب تک جذبۂ قاسمی، بصیرت مونگیری، اضطراب شبلی، جرأت جوہر، حکمت ابوالکلام، جوشِ سیوہاروی اور جنونِ سرسید سے عقل ودل کو آراستہ نہیں کیا جائے گا تب تک حالات کا رخ ہرگز نہیں بدلے گا۔

معاف کیجئے مدارس ہیں، یونیورسٹیز ہیں، کالجز ہیں، اسکولز ہیں، تنظیمیں اور جماعتیں ہیں، ممکن ہے جس قدر ضرورت ہے اتنی تعداد میں نہ ہوں مگر ہیں، پھر آخر روز افزوں حالات کیوں بگڑتے جا رہے ہیں، احتساب کی ضرورت ہے، جو قومیں احتساب سے اعراض کرتی ہیں تاریخ انھیں فراموش کر دیا کرتی ہے، ضرورت ہے کہ احتساب کیا جائے اور خوف و ہراس اور احساس کمتری سے باہر نکل کر حالات کا مقابلہ کیا جائے، ہمارا ایمان ہے کہ ہمیں اللہ ضائع نہ کرے گا، بشرطیکہ ہم اللہ والے بن جائیں، اس لیے ہمیں ایک طرف تو ایمان کامل کا درس لینا ہے، دوسری طرف اس ملک میں پوری قوت کے ساتھ اپنے تحفظ وبقا کی

جنگ لڑنی ہے، مسائل پیدا ہوتے رہیں گے مگر ایمان وحکمت وعملی سے ان کا مقابلہ کیا جائے گا، کون ہے جو آپ کو وندے ماترم پڑھنے پر مجبور کرے، دستور نے دفعہ ۲۹، ۳۰ کے ذریعہ ہر کسی کو مذہبی آزادی دی ہے، آپ جرأت کے ساتھ کہیے کہ ہم نہیں پڑھتے مشرکانہ گیت اور سینہ تان کر کہیے کہ ہم سے مذہب مخالف مطالبات کا مطلب دستور وطن کی مخالفت ہے، بلکہ دستور سے بغاوت ہے، اور اگر آپ کو یہی منظور ہے کہ اسکولوں میں وندے ماترم پڑھی جائے تو یاد رکھیے ہمارے بچے ان پڑھ رہیں گے مگر شرک نہیں کریں گے، ہم اسکولوں سے اپنے بچوں کو ہٹالیں گے، یہی کہا تھا حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے، ہم ایمان کا سودا ہرگز نہیں کر سکتے، اب تو ایک عرضی کے جواب میں سپریم کورٹ کی جسٹس شرماوالی بنچ نے بھی صاف کر دیا ہے کہ قانون میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو وندے ماترم کو راشٹریہ گیت مقرر کر سکے یا اس کو بڑھاوا دے سکے، **پوری قوت کے ساتھ اور اپنی تاریخ سے واقف ہوکر احساس برتری کے ساتھ یہ اعلان کیجئے کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم ہی اس کے مالی ہیں ہم اسے ہرگز برباد نہیں ہونے دیں گے، یہاں کا دستور مختلف قوموں کے آپسی معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے ہم پہلے مسلمان ہیں اور مسلمان رہتے ہوئے دستور کی وفاداری کریں گے، دیش بھکتی کا جو معیار دستور نے متعین کیا ہے ہم پورے طور پر اس کے وفادار ہیں، البتہ کسی پارٹی کی حکومت بنے اور ہم کو اپنی مرضی سے چلانا چاہے تو اس کا امکان نہیں، کیوں کہ یہ دستور کی بھی مخالفت ہے اور اس ملک کی بہت پرانی سنسکرتی سے بغاوت ہے، ہمارے بزرگوں نے پوری بصیرت کے ساتھ یہاں رہنے کا اور یہیں جینے مرنے کا فیصلہ کیا ہے تو ہم یہاں اپنے مذہبی تشخص اور اپنی شان کے ساتھ رہیں گے، یہ ہمارا حق ہے،** ہم آپ سے کہتے ہیں کہ مایوسی کی کوئی بات ہے ہی نہیں، آج حالات بدتر ضرور ہیں مگر اتنے نہیں جتنے تقسیم ملک کے بعد تھے، جب سب کچھ لٹ گیا تھا، قیادت کرنے والے اچانک احساس غلامی سے دوچار ہوگئے تھے، خاندان بچھڑ گئے تھے، بڑے بڑے رئیس زادے سڑک پر آگئے تھے، ہر طرف ہُو کا عالم تھا، دہلی کی گلیاں لاشوں سے پٹی پڑی تھیں، مگر ہاں اس وقت اور آج میں ایک فرق ہے، اس وقت کچھ بندگان خدا ایسے تھے جو بیدار مغز تھے، دلِ دردمند رکھتے تھے، قیادت کے ہنر سے واقف تھے، مفادات سے بالا ہوکر سوچتے تھے، آج بھی ایسے لوگ ناپید نہیں ہیں اگرچہ کم ہیں، پھر ہم کو تو یہ بات اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ مایوس وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس کوئی ابدی اور عالمی پیغام نہ ہو، یا وہ ہوتے ہیں جن کا مطمح نظر ادنیٰ اور رذیل مفادات ہوں، اہل ایمان تو مثل خورشید ہیں ادھر ڈوبے ادھر نکلے، آپ یہ فیصلہ کیجئے کہ حکمت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا اور اسی وطن کی مٹی سے اپنا مکان تعمیر کرنا ہے اور دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ ہم اس شمع کے مانند نہیں جس کو پھونکوں سے بجھایا جا سکے، ہم کو ٹھونک کر یہ بات کہنا چاہیے اور ببانگ دہل اعلان کرنا چاہیے کہ ہم تھک ہار کر بیٹھنے والے نہیں، ہم مایوس ہونے والے نہیں، وطن کو ہم محبوب سمجھتے ہیں معبود نہیں، ہم اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ہندی ہیں ہم سارا جہاں ہے وطن ہمارا، ہم سب سے پہلے خدا، اس کے رسول اور قرآن کے پاسدار ووفادار ہیں، ہم کو اپنے وطن کی مٹی سے بہت پیار ہے مگر ہم اس کی عبادت نہیں کر سکتے، پھر جس چیز کے بارے میں سپریم کورٹ نے اپنی رولنگ میں صاف کر دیا کہ کسی گیت کو کسی پر تھوپنے کی قانون میں کوئی گنجائش نہیں اس کے بارے میں ہمیں بیک فٹ پر جانے کی کیا ضرورت،

اس وقت ملک کی صورت حال وہی ہے جو''افغانستان'' پر حملے کے وقت امریکہ نے پیدا کی تھی کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جو ہمارے ساتھ نہیں وہ دہشت گردوں کا معاون ہے، ٹھیک اسی طرح جو بی جے پی کے ساتھ نہیں یا اس کا مخالف ہے وہ دیش بھکت نہیں بلکہ دیش دروہی ہے، ہمیں آزادی سے پہلے اور آزادی کے متصلا بعد اپنے اسلاف کی قربانیوں کی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے اس ملک میں امن وانصاف پسند لوگوں کو ساتھ لے کر اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآنی بشارتوں کو پڑھیے، سنیے اور سیرت محمدی کے مکی عہد کے اسوہ سے دلوں کی تسکین کا سامان کیجئے، جو لوگ خوف و مایوسی کی باتیں کرتے ہیں انھیں مدنی عہد کی بشارت سنا کر مخلصانہ جہد مسلسل کی تلقین کیجئے اور جگر مرحوم کی زبان سے یہ پیغام خوب سنیے، دوسروں کو ان مطالبات سے واقف کرائیے اور اپنے اس آہنی عزم کو عام کیجئے۔

حسین دل مبتسم نگاہ پیدا کر
پھر ایک لطیف سی خاموش آہ پیدا کر
جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے
قدم قدم پہ وہ اک شمعِ راہ پیدا کر
خلوص عشق و یقین حیات کے ہمراہ
جنون شوق وجنونِ نگاہ پیدا کر
رگوں میں بھر کے فروغ جمال الا اللہ
نظر میں شعلگیٔ لا الہ پیدا کر
یہی زمین ترا مسکن یہی ترا مدفن
اسی زمین سے تو مہر وماہ پیدا کر

نظر میں شعلگیٔ لا الہ پیدا کر

جزیرۃ العرب مہبط وحی ہے، وہاں کے باشندے قرآن کے اولین مخاطب تھے، ان ہی کو مخاطب کر کے نظر میں شعلگیٔ لا الہ پیدا کرنے کی اولین دعوت دی گئی تھی، ان ہی کو سب سے پہلے طاغوتی نظام، طاغوتی طاقتوں کے انکار کی دعوت دی گئی اور پھر حق سے مقابلہ آرائی کرنے والی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کا مطالبہ ان ہی سے کیا گیا، ان ہی کے ذریعہ جزیرۃ العرب کو کفر وشرک کی آلائشوں سے پاک کرنے کا کام کیا گیا، ان سے ہی سب سے پہلے اس کا مطالبہ کیا گیا کہ وہ پوری دنیا کو لا الہ کے پیغام سے واقف کرائیں اور الا اللہ کے جلال وجمال سے آگاہ کریں، ان سے ایمان کے ساتھ ساتھ طاغوت کے انکار کا مطالبہ کیا گیا، ارشاد ہوا فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ اللہ پر کامل ایمان کی علامت ہی طاغوتی نظام اور طاغوتی طاقتوں کے انکار کو قرار دیا گیا اور اسی انکار پر فقد استمسك بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا کی بشارت دی گئی، اور اس کے بعد نہایت طاقتور پیغام سنایا گیا اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمت الی النور، نصرت الٰہی اور غلبہ دین اور استحکام قوت کی بشارتیں اسی انکار لا یشرکون بی شیئا کی شرط پر سنائی گئیں، اور ساتھ ہی لا الہ کے وسیع تر مطالبات پورا کرنے کا عہد لیا گیا اور بار بار اس عہد کی یاد دہانی کرائی گئی، مگر صد افسوس وحسرت کہ آج صورت حال اس کے برعکس ہوگئی، جزیرۃ العرب کے باشندے طاغوت کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور ہوگئے، وہ طاغوت کے در پر سجدہ ریز ہوگئے، آج جزیرۃ العرب میں تہذیبی، تمدنی اور فکری افق پر

طاغوت کا تسط قائم ہو چکا، اسلام کا نام لینے والے دہشت گرد قرار دیے جانے لگے، نظروں میں توحید کا نور رکھنے والے، پیشانی پر نور خدا رکھنے والے، لبوں پر لا الہ کا کلمہ رکھنے والے مجرم اور بدترین مجرم قرار دیے جانے لگے، آج جو صورت حال ہے اس کی عکاسی کچھ اس طرح قرآن نے کی ہے والذین کفروا اولیئھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمت، افسوس کہ وہ لوگ نفس و طاغوت کے غلام ہو گئے جنہیں اس کا حکم تھا کہ ؎

رگوں میں بھر کے فروغِ جمال الا اللہ
نظر میں شعلگیِ لا الہ پیدا کر

سوچیے ذرا یہ خبر کتنی اندوہناک ہے کہ محمد بن سلمان کی ولی عہدی پر اسرائیلی پریس نے خوشی کا اظہار کیا، اور جس کی ولی عہدی پر اسرائیل خوشی کا اظہار کرے آپ اندازہ کر سکتے ہیں وہ کیا ہوگا، آخر پس پردہ کیا ہے جو آپ نہیں سمجھتے، کیوں آخر محمد بن نائف رات بھر قید میں رکھا گیا، وہ تو شاہی خاندان میں بادشاہ کے بعد سب سے طاقتور اور با اثر شخص تھا، اسے مجبور کر کے جب محمد بن سلمان کی بیعت لے لی گئی تو پھر انھیں نظر بند کیوں کر دیا گیا، اس کے علاوہ یہ خبر کتنی تکلیف دہ ہے کہ ریاض میں ایک دفتر قائم ہوا ہے، جس پر امریکہ کے وزیر خارجہ ٹریلسون کا بیان شاہد ہے، جو نصاب کی تنقیح کا کام کرے گا یعنی نصاب کو مسلمان تو رکھے گا مگر اس سے اسلامی روح نکال لے گا، اقبال کی زبان میں نصاب کو مکمل فرنگی رنگ دے کر حجاز و یمن سے اسلام کو دیس نکالا دینے کی تیاری ہے، اب تو ابن تیمیہ اور ابن القیم کی بساط بھی لپیٹ دی جائے گی، محمد بن عبدالوہابؒ کی فکر اور سلفیت کا جنازہ بھی تیار ہے، سعودیہ عملا سیکولر اسٹیٹ بن گیا بس سرکاری اعلان باقی ہے، یہ ادارہ معتدل فکر کے نوجوان ائمہ بھی تیار کرے گا، یعنی اس ادارے کے ذریعہ اسلامی روح سے عاری ائمہ وخطباء مساجد میں مقرر کیے جائیں گے، یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کیوں کہ اس ادارے کی براہ راست سرپرستی و نگرانی وائٹ ہاؤس کرے گا، اور وائٹ ہاؤس جس اسلام کو زندگی کی ضمانت دیتا ہے اس کی قرآن وسنت میں کوئی گنجائش نہیں، مگر عرب جاگیردار اپنی عملی کوتاہیوں سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اب وہ سیکولرزم اس طوق کو اپنے گلے میں ڈال لیں اور شداد کی بنوائی، جنت میں دادعیش دیتے رہیں، کاش کہ وہ اپنے پیش رووں سے سبق لیتے اور ہوش میں آجاتے، اس کے ساتھ یہ خبر بھی سنیے اور خون کے آنسو روئیے کہ سعودی حکومت اب خواتین کے لیے ریزارٹ قائم کرے گی جہاں انھیں سوئمنگ لباس پہننے کی مکمل اجازت ہوگی، اختلاط کی گنجائش ہوگی، جہاں پردے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی، زر کی ہلاکت خیزیوں نے تو یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ طاغوت کی حکمرانی عملا قائم ہوگئی، اب زن کی تباہ کاریاں خدا جانے کیا حال بنائیں گی۔

سعودیہ و امارات کی گندی سیاست کا حال یہ ہے کہ ایک طرف قطر کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا کہ اس کے تعلقات اخوان وحماس سے ہیں اور اخوان وحماس ایران کے حامی ہیں، دوسری طرف خود محمد بن سلمان نے عراقی شیعہ رہنما مقتدی الصدر کا سربراہان مملکت کے پروٹوکول کے ساتھ استقبال کیا، خدا جانے کہ بند کمرے میں کیا گفتگو ہوئی ہو اور کون سی نئی سازشیں تیار کی گئی ہوں، کیوں کہ مقتدی الصدر وہ شخص ہے جس کی گردن پر عراق کے ہزارہا سنیوں کے قتل کا بوجھ ہے، صدام حسین کی پھانسی کے

وقت یہ کھڑا ہو کر ہنس رہا تھا، ایران اور شیعیت کو مجوسی لکھنے والے یہ سعودی دوغلی پالیسی اختیار کرتے ہیں، ایران کے حجاج کے پہلے وفد کا استقبال خود وزارت حج کے ذمہ داروں نے کیا اور اس کے کوٹے میں اضافہ بھی کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ آل سعود کو اپنے مفادات عزیز تر ہیں اور ایران سلطنت فارس کا خواب دیکھتا ہے، دونوں کسی حال میں فی الوقت ایک دوسرے کے سامنے نہیں آنا چاہتے، البتہ ایران کے ناپاک عزائم سے کون واقف نہیں، لیکن اتنی بات طے ہے کہ ایران کے خاکوں میں رنگ بھرنے کا کام آل سعود کی غلط کاریاں اور ناعاقبت اندیش پالیسیاں کر رہی ہیں، جس کا نقصان خود ان کو ہی سب سے زیادہ اٹھانا پڑے گا، اب تو سب کچھ عیاں ہو گیا، کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں رہا، پھر بھی اگر کوئی دفاع میں اتر آئے اور سعودیہ وامارات کے دوغلے پن کی تعریفیں کرے تو اس کے ضمیر پر انا للہ پڑھ لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، تازہ ترین خبریں یہاں تک ہیں کہ سعودیہ ایران سے تعلقات کے لیے کوشاں ہے، لوگوں کو اس کے لیے وسیلہ بنا رہا ہے اور خوشامد میں لگا ہے، مقتدی الصدر کا دورہ اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

حرکۃ المقاومۃ الاسلامیہ جیسی تاریخ ساز جماعت کو دہشت گرد کہنا، محمد بن عبدالوہاب کی فکر کو اور اس سے پہلے مولانا مودودی اور سید قطب اور اب علامہ قرضاوی اور مولانا سید ابوالحسن ندوی کی کتابوں میں دہشت گردی کے مواد کا الزام لگا کر ان کی تنقیح اہل کلیسا سے کرانا اہل اسلام کے اخلاقی، سیاسی اور فکری دیوالیہ پن کی علامت ہے، فریب ومکر کا حال یہ ہے کہ ابھی حال ہی میں جب اسرائیل نے مسجد اقصی کے ابواب پر سیکورٹی بڑھائی اور جدید ترین تفتیشی آلات نصب کیا، تو فلسطینی قوم نے اپنی پوری اجتماعی قوت کے ساتھ احتجاج کیا، مسجد اقصی کے ابواب پر بوڑھے بچے اور عورتیں ڈٹے رہے اور رب ذوالجلال کے آگے گڑگڑاتے رہے، اسرائیلی فوجیوں کے سامنے ہاتھ اٹھا کر اپنے رب کی بارگاہ میں ان کی تباہی وہلاکت اور اپنی فتح ونصرت کے لیے دعائیں مانگتے رہے، تیرہ دنوں تک مسجد اقصی سے رب کریم کی وحدانیت کا بگل بجانے والی اذان کی آواز نہیں اٹھی، بالآخر اسرائیل کو نہتے فلسطینیوں کے آہنی عزم کے آگے سپر ڈالنی پڑی اور بیت المقدس وہاں کے بے بس مسلمانوں کے فلک شگاف نعرات تکبیر سے گونج اٹھا، مگر معذور سعودی شاہ کی بے شرمی دیکھیے کہ اس پورے عرصہ میں نازنینوں کی طرح بھی لبوں کو جنبش نہ دے سکا، لیکن اس کامیابی کا کریڈٹ لینے کو فوراً میدان میں آ گیا، اس کا بیان صریح جھوٹ پر مبنی تھا، اس کے بقول اگر اس نے مداخلت کی بھی (جب کہ حقیقت اس کے خلاف ہے) تو بھی ظاہر ہے کہ اس کی مداخلت سے کیا فرق پڑتا ہے جو اسرائیلی جارحیت کے آگے سپر ڈال چکا، اسرائیل نے بارہا عالمی قوانین کی خلاف ورزی کی ہے، اس کی پیدائش ہی خلاف قانون ہے، اس کو جنم دینے میں آل سعود کا کردار واضح ہے، تو اب اس کے مقابلہ کی ان لوگوں سے امید بھی دیوانے کا خواب ہے، یہ اس کے جنگی جرائم اور عالمی قوانین کی خلاف ورزیوں کے خلاف سلامتی کارخ بھی نہیں کر سکتے اور اگر دنیا کو دکھانے کے لئے کر لیں تو کیا حاصل ہوگا، اسی جارح کی انگلی پکڑ کر چلنے والا دادا امریکہ ویٹو پاور کا استعمال کرتا ہے اور اس محاورہ کی تصدیق کرتا ہے ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس''، اب تو بس خدائے ذوالجلال سے دعا ہی کی جا سکتی ہے اور وإن تتولوا یستبدل قوما غیر کم ثم لا یکونوا امثالکم کے نتائج کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔

اب جبکہ سعودیہ برہنہ ہوکر سامنے آ گیا تو سب سے بڑی ذمہ داری علماء کے کاندھوں پر آ گئی، یہ انسانوں کا وہ طبقہ ہے جس نے ہمیشہ حق کا پرچم بلند کیا ہے، اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے، زبانیں تراش دی گئی ہیں لیکن روکی نہ جاسکی ہیں، انگلیاں کاٹ دی گئیں ہیں لیکن ان ہی انگلیوں سے ٹپکتے خون نے تاریخ رقم کی ہے، وہاں کے علماء تو معذور سمجھے جائیں، کچھ تو پہلے ہی یشترون بآیاته ثمنا قلیلا کی مثال بن چکے، قطر کے مقاطعہ کے واقعہ میں کچھ اور لوگ پوری بے شرمی کے ساتھ قرآن و سنت کا مذاق بناتے ہوئے سامنے آ گئے، جو کچھ جرأت گفتار اور مجاہدانہ کردار رکھتے تھے، انھیں اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا، نہ جانے کتنے قید میں ڈال دیے گئے، کتنے نظر بند کر دیے گئے، جن کو قید کرنا مصالح عامہ کے خلاف تھا انھیں مجبور کر دیا گیا کہ صبح وشام کے اذکار بتانے پر اکتفا کریں، مولانا علی میاںؒ عالم عربی کے علماء کی عیش وعشرت سے بھرپور زندگی اور سرکاری مراعات کو دیکھ کر کڑھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اس کے بعد پھر حق کی ترجمانی ممکن نہیں، اب تو وہ وقت آ گیا جب استنباط واستنتاج بھی طاغوت وقت کی مرضی کے مطابق کیا جانے لگا، ایسی صورت حال میں جن کے زبان وقلم آزاد ہیں، وہ خدا کی اس نعمت کا فائدہ اٹھائیں اور حق لکھیں، حق بولیں ورنہ خدا کی گرفت سے بچ پانا محال ہے، اب مدلل مداحی کا زمانہ جاتا رہا، اب کسی بھی مذہبی طبقہ کو ان حکومتوں سے پذیرائی کی امید لگانا فضول ہے، اور یہ فکر تو انتہائی لچر ولاغر ہے کہ اگر حق بات کہی گئی تو مدرسہ کا چندہ بند ہو جائے گا، ظاہر ہے کہ حق کا سودا کر کے، منکرات سے نظر چراتے ہوئے، حرمت حرمین کی پامالی پر لب سی کر، جزیرۃ العرب کی حرمت کے داؤ پر لگنے سے آنکھیں بند کر کے جو چندہ حاصل کیا جائے گا، سوال یہ ہے کہ اس سے جو کھیپ تیار ہوگی اس کی قلبی، روحانی اور دینی واخلاقی کیفیت کیا ہوگی، اقبال نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے ؎

اے طائر لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اب اتنا سب کچھ طشت از بام ہونے کے بعد ضروری ہے کہ اپنے صحیح موقف کا اظہار کیا جائے، الحمدللہ بہت سے لوگ جو پہلے مصلحتاً نہیں بولتے تھے اب بولنے لگے ہیں یا کم از کم کسی طرح کی تائید سے گریز کرنے لگے ہیں، ابھی چند دنوں قبل سعودیہ کی حمایت میں دہلی کے بے قد وکردار مگر بظاہر ''شاہی امام'' سے ملقب ''بڑے حضرت'' نے ایک بیان دیا، جس میں مکر، جھوٹ، بے بنیاد من گڑھت کے سوا کچھ نہیں تھا، جہاں وہ بیان ان کی بے مائیگی اور ذہنی وعلمی افلاس اور اخلاقی دیوالیہ پن پر دلالت کر رہا تھا وہیں اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ شاید اس مرتبہ حقائق کی اتنی وضاحت ہو جانے کے بعد، مالدار سفارت خانے کو کوئی اور ہاتھ نہ آ سکا، رگِ غیرت سب ہی کی پھڑک گئی مگر یہ بے چارے!! آج کل یوں ہی ان کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہیں، نہ مرکز میں ان کی ناز برداری کرنے والی جماعت رہی اور نہ اتر پردیش میں ان کے نخرے دیکھنے والے رہے، تو کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پاؤں مارنے کو چاہیے تھا، بہرحال یہ سب کچھ اس لیے لکھا جاتا ہے کہ ہمارے ذہنوں کو صحیح غذا ملے، ہم حقائق سے واقف ہوسکیں، اپنے بس بھر حق کی سربلندی کے لیے کام کرسکیں، وقت اور موقع کی مناسبت سے صحیح موقف کا اظہار کرسکیں اور خدا کے حضور میں باطل سے نبرد آزما

مظلوموں کے لئے دعا کرسکیں اور اپنے ہی درمیان اغیار اور طاغوتی طاقتوں کا شکار ہونے والوں کی کج فکری اور گمراہ کن بیانات سے اپنے ذہنوں کو پاک کرسکیں، رہے وہ لوگ جو حقائق کے روز روشن کی طرح عیاں ہونے کے باوجود درباری مدح سرائی میں ہی مبتلا ہیں، ہر برے سے برے اقدام کو صادر کرنے پر آمادہ ہیں اور ہر طرح انھیں کو حق بجانب ٹھہرانے پر بضد ہیں، تو ان سے تو بس یہ کہہ کر دامن جھاڑ لیجئے کہ ؎

میری نگاہ میں وہ شخص آدمی بھی نہیں
جسے لگا ہے زمانہ خدا بنانے میں

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

خوشخبری

الحمدللہ ندائے اعتدال کے مدیر محترم کے فکر انگیز اداریوں کے متعدد الگ الگ مجموعے منظر عام پر آگئے ہیں، کچھ اور مفید کتابیں ساتھ میں شائع ہوئی ہیں جبکہ کچھ زیر ترتیب وطباعت ہیں، قارئین ان کو حاصل کرنے کے لئے لکھنو علیگڑھ کے مکتبات کے علاوہ ہم سے بھی رابطہ کرسکتے ہیں:

فیض الاسلام ندوی

واٹس اپ 9627961774 موبائل نمبر 8532822877

عالم اسلام: مصر، شام، سعودی عرب اور ترکی سے متعلق لکھے گئے مضامین، وہاں اٹھنے والی تحریکات کے تعارف وتجزیہ اور واضح وصریح اسلامی موقف پر مبنی مضامین کا مجموعہ، جس پر پروفیسر محسن عثمانی ندوی صاحب کا طویل وبصیرت افروز مقدمہ اور مولانا سید سلمان حسینی ندوی صاحب کی فکر انگیز تقریظ بھی ہے۔ صفحات: ۲۲۶، قیمت: ۱۶۰

تصویر وطن: ہندستان کے سیاسی، سماجی حالات کا تجزیہ، مسلمانوں کی سیاسی سماجی، اخلاقی، تعلیمی اور دینی صورت حال کا تجزیہ، اس ملک میں زندہ رہنے کے لیے اہم مشورے اور اپنے تشخص کے بقاء وتحفظ کے لیے اہم اور فکر انگیز اشارے جس پر معارف کے مرتب مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب کا طویل تجزیاتی مقدمہ ہے۔ صفحات: ۲۵۶، قیمت: ۱۸۰

نقوش فکر وعمل: بعض تنقیدی و اصلاحی اور فکری کج روی کو واضح کرنے والے صریح وفکر انگیز مضامین کا مجموعہ۔ صفحات: ۱۳۶، قیمت: ۱۰۰

مسجد اقصی سے متعلق چالیس حقائق: ڈاکٹر عیسی القدومی کے مفید اور تعارفی رسالے مع تصاویر کا اردو ترجمہ بعض مفید وولولہ انگیز تحریروں کے اضافے کے ساتھ۔

.....

زیر ترتیب وطباعت کتب:

قرآن کریم کے دوسو الفاظ: ایک مصری مصنف کے اہم علمی رسالہ کی اردو ترجمانی جس میں قرآن مجید کے ایسے دوسو الفاظ کی لغوی تشریح ہے جن کی مراد سمجھنے میں ابتدائی مرحلہ میں عام طور پر لوگ غلطی کر جاتے ہیں۔

ہمارے بچے: تربیت اولاد سے متعلق اردو میں اپنے طرز کی منفرد کتاب جو ایک شامی نژاد، ماہر نفسیات اطفال کی عربی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے، کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی تعلیمات اور نفسیاتی اصولوں کی یکساں طور پر رعایت کی گئی ہے، اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

سیرت کا انقلابی پیغام: سیرت نبوی سے فائدہ اٹھانے اور معاشرے میں اس کو عام کرنے پر ابھارنے والی، پر جوش و نشاط انگیز تحریروں کا مجموعہ۔

اتحاد- اہمیت وضرورت: مختلف اوقات میں اتحاد کی اہمیت وضرورت، اسکے تقاضوں اور طریقۂ کار پر قلم بند کیے گئے اداریوں کا مجموعہ۔

تعلیم وتربیت: نصاب ونظام تعلیم اور تربیت کو موضوع بنا کر جو تجزیاتی مضامین واداریے لکھے گئے ان کو اس مجموعہ میں جمع کیا گیا ہے، جس سے فکر وعمل کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

اس کے علاوہ **''رشحات قلم''** کے نام سے علمی اور ادبی مضامین اور **''قلبی تاثرات''** کے نام سے سوانحی مضامین اور **''ندائے اعتدال کے تبصروں''** کو آئندہ انشاء اللہ کتابی شکل میں الگ شائع کرنے کا ارادہ ہے، امید ہے کہ ہمارے قارئین دعاء فرمائیں گے اور معاونین تعاون فرمائیں گے۔

☆☆☆

❑ پیام سیرت

تیرے لئے قربان ہیں سب رشتے ناطے

محمد فرید حبیب ندوی

''آپ اس بستر پر نہیں بیٹھ سکتے''۔

یہ کہہ کر اس نے بستر لپیٹ دیا۔

وہ بستر کی سلوٹیں دیکھتا رہا اور اس عجیب سچویشن کے بارے میں سوچتا رہا۔

قدرت نے آج اسے کس موڑ پہ لا کھڑا کیا تھا۔

اپنے وقت کا قد آور اور پر جلال بادشاہ.....تخت پر بچھے ایک بستر کے لائق نہیں!!

جلال امیری اور قہر سلطانی ایک بستر کی سلوٹوں میں گم ہوتا محسوس ہوا۔

کوئی اور ہوتا .....تو شاید اس کے دل کو ٹھیس نہ پہنچتی .....مگر اس کی اپنی بیٹی ..... یہ سب کچھ کر رہی تھی۔

اس کا دل اشکوں کے چند قطروں میں سمٹ کر رہ گیا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بات اس حد تک جا سکتی ہے۔

یہ جملہ اس پر بجلی بن کر گرا.....اور وہ اس کی گہرائیوں میں کھوتا چلا گیا۔

وہ سوچنے لگا کہ ایسی کیا چیز ہے جس نے بات یہاں تک پہنچا دی ہے۔

کیا میں اس لائق بھی نہیں کہ اس بستر پہ بیٹھ سکوں۔

''میں کتنی دور سے صرف تم سے ملنے آیا ہوں.....اور تم مجھے بیٹھنے کے لئے بستر بھی نہیں دے سکتیں''۔اس کا سارا درد اس تعجب خیز سوال میں در آیا۔

''میں یہ بستر آپ کو نہیں دے سکتی''۔

یہ جواب اس کے لئے کسی صاعقۂ آسمانی سے کم نہ تھا۔

اس غم انگیز والم ریز جملے نے زمانے کے دبیز پردوں کو چاک کر کے حال کو ماضی کی سرحدوں سے ملا دیا۔

وہ سوچتا رہا.....اور گذرے دنوں کو یاد کرتا رہا۔

''کتنے لاڈ پیار سے پالا تھا میں نے اسے''۔ایک آہ سرد کے ساتھ اس نے سوچا۔

گذرے دنوں کی تصویریں اس کے پردۂ ذہن پر ابھر کر آتی رہیں.....اور چند ساعتوں میں اس نے ماضی کے سارے نشیب و فراز دیکھ ڈالے۔

''میں تم سے ملنے آیا ہوں.....اور تمہارا یہ رویہ؟.....کیا تمہارے دل میں میرے لئے ذرا بھی محبت نہیں''۔

''کیوں نہیں.....مجھے آپ سے بہت محبت

ہے.....اور مرتے دم تک رہے گی .....آپ نے مجھے پالا ہے.....میرا بچپن آپ کی گود میں بسر ہوا ہے.....میرے ایک ایک بال پر آپ کا احسان ہے.....میں آپ کی ممنون کرم ہوں.....آپ میرے والد ہیں اور میں آپ کی بیٹی .....اور یہ رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوسکتا''۔

''پھر یہ بے رخی کیسی؟.....کیا یہ بستر میرے لائق نہیں.....یا.....میں اس بستر کے لائق نہیں؟''۔

''آپ اس بستر کے لائق نہیں''۔

وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

''کیوں.....آخر ایسی کیا بات ہے اس میں؟''۔

''اوہ!.....آپ سمجھنے کی کوشش تو کریے''۔

''بیٹی ! میں اور کیا سمجھوں .....سب کچھ تو سمجھ چکا ہوں.....مگر میں تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں''۔

''بابا جان ! یہ بستر نہایت مبارک ہے.....اس کی پاکیزگی رشک ملائک ہے.....اس پر اس ذات عالی کا جسد اطہر مس ہوا ہے، جس نے دنیا میں طہارت و پاکیزگی کا فیضان کیا ہے.....یہ بس اسی کو زیبا ہے''۔

''ٹھیک ہے یہ ان کا بستر ہے.....لیکن اگر میں اس پر بیٹھ جاؤں، تو حرج کیا ہے؟''۔

''اوہ! میں آپ کو کیسے بتاؤں.....یہ اتنا پاکیزہ ہے کہ شرک کی گندگی میں ملوث کوئی ناپاک بدن اس کے لائق نہیں.....یہ پاک ہے اور پاک لوگوں کے ہی لائق ہے''۔

یہ قصہ ہے حضرت ام حبیبہؓ کا، جو حضور اکرم ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں، اور ابوسفیان کی بیٹی، یہ اس وقت کی بات ہے جب ابوسفیان مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ اپنی بیٹی سے ملنے ان کے گھر گئے، تو چارپائی پر بستر بچھا ہوا تھا، جیسے ہی ابوسفیان نے اس پر بیٹھنا چاہا، ام حبیبہؓ نے بستر اٹھادیا اور فرمایا: ''یہ رسول اللہ ﷺ کا بستر ہے، اس پر کوئی مشرک نہیں بیٹھ سکتا''۔

یہ واقعہ پڑھیے اور سر دھنیے.....اس کے پیچھے چھپے جذبے کا سراغ لگایئے.....اس کی گہرائیوں میں اتریے.....اور سوچیے ! وہ کیا چیز تھی جس نے ایک بیٹی کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنے باپ کے آنے پر تخت پر سے بستر سمیٹ دے.....ایسی بیٹی جو نافرمان نہ تھی .....جو اپنے باپ سے بہت محبت کرتی تھی.....اور جو اپنے والد کی قدرداں بھی تھی۔

اس کے پیچھے بس ایک ہی جذبہ تھا.....اور وہ تھا محبت رسول کا جذبہ۔

اس کی محبت نے گوارا نہ کیا کہ جس بستر پہ رسول اطہر ﷺ تشریف رکھتے ہوں.....جس بستر سے ان کا پاک بدن مس کرتا ہو .....اس پر کسی مشرک کا بدن رکھا جائے.....خواہ وہ ان کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔

یہ جذبہ صحابہ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اسی جذبے نے ان کی کایا پلٹ کی تھی .....اسی نے مس خام کو کندن بنایا تھا.....اسی نے انہیں تحت الثری سے اٹھا کر ثریا تک پہنچایا تھا.....اور صحیح الفاظ میں اسی جذبے نے انہیں

انسان بنایا تھا..... یہ جذبہ ان کے رگ وریشے میں سمایا تھا.....ان کی رگوں میں خون کی بجائے یہی جذبہ گردش کرتا تھا.....اسی لئے وہ اس جذبے پر کسی طرح کا سودا کرنے کو تیار نہ تھے.....وہ سب کچھ قربان کر سکتے تھے،مگر یہ جذبہ نہیں ..... بلکہ وہ اس کی حفاظت کی خاطر سب کچھ کھو سکتے تھے.....ماں کا پیار بھی اور باپ کی شفقت بھی .....اور دنیا کی یہ فانی زندگی بھی.....ان کی زندگیاں اسی جذبے کا عکس تھیں .....اور وہ اسی کے سہارے جیتے تھے۔

وہ بھی اسی جماعت کی ایک فرد تھی.....وہ بھی اسی جذبے سے سرشار تھی.....وہ تھی تو ایک عورت.....لیکن اس کا جذبۂ محبت ہزاروں مردوں پر بھاری تھا۔

اس قصہ کی روشنی میں ذرا ہم اپنا جائزہ لیں .....رسول اللہ ﷺ سے ہمیں کتنی محبت ہے.....حضرت ام حبیبہؓ نے آپ ﷺ کی خاطر اپنے باپ کی ناراضی مول لے لی،مگر اس محبت پر حرف نہ آنے دیا.....اور آج ہمارا حال یہ ہے کہ جگہ جگہ ہم اس جذبے کی توہین کرتے ہیں.....زندگی کے ہر موڑ پر قسمت ہمارا امتحان لیتی ہے اور ہم دنیا کے ذرا سے نفع کے لئے اس جذبے کا سودا کر بیٹھتے ہیں..... بلکہ اب تو حال یہ ہے کہ ہمارے سینے کی انگیٹھی اس جذبے سے ہی خالی ہو چکی ہے.....ہمارے اندرون میں اس کی تڑپ باقی نہیں ہے.....ہمارے اندر اس سے کوئی ہلچل اور اضطراب پیدا نہیں ہوتا.....کارگاہِ حیات میں یہ جذبہ ہمارے لئے سرد پڑ چکا ہے اور اسی لئے کشمکش زندگی میں ہم اس سے کوئی رہنمائی نہیں حاصل کر پاتے.....اس جذبے کو جو حاصل زندگی اور متاع زیست کی حیثیت رکھتا تھا،ہم آئے دن چند ٹکوں کی بھینٹ چڑھاتے رہتے ہیں.....اور جب ہمارا اندرون ہی خالی ہو گیا تو پھر باہر کی دنیا میں ہم نے کیا کیا گل کھلائے،ہم خود واقف ہیں۔

آج ہم عملی طور اس جذبے سے محروم ہیں.....اتباع و پیروی رسول اللہ ﷺ کا حق ہے..... اور ہم نے یہ حق دوسروں کو دے رکھا ہے..... ہم دوسروں کے نقوش راہ کے پیچھے چلتے ہیں..... ہماری زندگی کا رہن سہن.....طرز معاشرت اور طریقۂ زندگی دوسروں کی تقلید پر مبنی ہے..... ہونا تو یہ چاہیے کہ ہمارے ایک ایک عمل سے حب رسول اور اتباع نبی کا نمونہ سامنے آئے۔

ضرورت ہے کہ پھر سے دل کی انگیٹھی کو اس جذبے سے دہکایا جائے.....ایک مرتبہ پھر آتش شوق بھڑکائی جائے .....ایک بار اور، دل کی دنیا میں انقلاب برپا کیا جائے۔اور اس کے لئے ضروری ہے کہ صحابہ کی زندگی کو پڑھا جائے اور برتا جائے۔حضرت ام حبیبہؓ کا مذکورہ بالا واقعہ اس کے لئے ایک بہترین رہنما ثابت ہوسکتا ہے..... اس میں عبرت و نصیحت ہے.....کشش ومقناطیسیت ہے۔اس میں جذبۂ حب رسول ہے.....اور یہ ہم سب کو دعوت فکر اور پیام عمل دیتا ہے۔

☆☆☆

❑ تعارف و تبصرہ

''تحریر بے عدیل'' پیمانۂ احتساب ہے

من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظرو ومابدلوا تبدیلا (الاحزاب:۲۳)

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گزر گئے
جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

''تحریر بے عدیل'' نامی یہ کتاب واقعی ایک ایسی کتاب ہے جو ہر کتب خانے کی زینت ہونا چاہیے، ملی، مذہبی اور سماجی کارکنوں کے مطالعہ میں ہونا چاہے، اس کتاب میں کیا ہے میں کیا بتاؤں اور کیسے کیسے بتاؤں، اس کتاب میں ایک پیکر اخلاص کے خلوص کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نام ونمود سے ماوراء جنون کی حد تک تڑپ کر کام کرنے والے مخلص خادم ملت اور رہنمائے قوم کے درد کو الفاظ کا پیکر دیا گیا ہے، اسکے تجربات و مشاہدات کو سمیٹ کر ایک بہترین کلیات تیار کیا گیا ہے، اس کتاب میں ایک مجاہد آزادی کی قربانیاں ہیں، ایک مجاہد اردو کی داستان جد وجہد ہے، ایک جرأت مند، بے باک، مصالح سے بالا ہوکر مومنانہ اور قائدانہ بصیرت سے معمور صحافت کی تاریخ رقم کرنے والے صحافی کے جھنجوڑنے والے شہہ پارے ہیں، اس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک فرزند باصفا کے ملی شعور کا نقشہ کھینچا گیا ہے، یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے تئیں ان کے پرخلوص جذبات اور بے لاگ کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کتاب میں آزادی سے قبل کانگریس کی پالیسیوں پر نقد اور اس سے اختلاف بھی درج ہے، اور آزادی کے بعد فوراً اس کے کرتوتوں کے سبب ملک کی تشویشناک صورت حال، مسلمانوں کی بے بسی، جبری تعلیم اور نصاب تعلیم کی تبدیلی، اس میں ہندو مذہب کے عناصر کی شمولیت کی داستان دلخراش بھی ہے، اس میں ملک کی ایک مؤقر، مؤثر، دور اندیش تعلیمی تحریک کی تاریخ بھی ہے، **اگر میں کہوں کہ یہ کتاب سیاسی وملی رہنمائی کے لئے ایک مکمل نصاب کی حیثیت رکھتی ہے تو شاید کسی کو اختلاف کی جسارت نہ ہوسکے،** یہ کتاب سوانح بھی ہے اور تاریخ بھی، بلکہ کہیے کہ تاریخ ساز اور مردم گر بھی ہے، اس میں راہ وفا کے ایک جانباز و پرجوش سپاہی کی داستان دلپذیر بھی ہے اور اس کے خلوص وللّٰہیت، مہر ووفا، سادگی وتواضع، غیرت وتدبر، حمیت دینی اور شعور ایمانی کا تذکرہ بھی، اس کو پڑھیے تو دشمنوں کے رخ سے نقاب الٹتی نظر آئے، ہمدردوں کے ذکر سے دل پسیج جائے، ملک کی خطرناک صورت حال کا صحیح اندازہ ہوجائے، سازشیں کرنے والوں کے ہتھکنڈوں سے واقفیت ہوجائے، ان سے مورچہ لینے کا طریقہ بھی معلوم ہوجائے، اس ملک میں اپنی غیرت اور اپنے تشخص کے ساتھ زندہ رہنے بلکہ اپنے موثر وجود کا احساس دلا کر زندہ رہنے کا ہنر بھی معلوم ہوجائے، میں کیا کہوں کہ اس میں کیا کیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر کہاں سے شروع کروں اور کیسے شروع کروں اور کہاں ختم کروں، واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں باطل شکن حوصلہ بھی ہے اور طاغوت سے نبرد آزمائی بھی، اس میں قدیم وجدید کے امتزاج کی سچی تصویر بھی ہے اور ہر حال میں مذہب کی بالادستی اور

مذہبی تشخصیات کی حفاظت کا مثالی جذبہ بھی، اس میں کانٹوں سے الجھنے کی کہانی بھی ہے اور دامن بچا کر نکل جانے کا طریقہ بھی، اس میں فولادی عزم، مومنانہ فراست، ایمانی قوت، چیتے کا جگر اور شاہیں کا تجسس بھی ہے اور عقابی روح بھی، اس میں خودی کا سرنہاں بھی ہے اور خودی کا تیغ فشاں بھی، اس میں جہد مسلسل، فکر کی بالیدگی و بلندی اور غمخوار ملت کا سوز دروں بھی ہے اور ساقی کی وارفتگی بھی، اس میں دانش افرنگ سے استفادے کا طریقہ بھی ہے اور اپنی تہذیب واقدار کے تحفظ کا طریقہ بھی، اس میں ملت کے لیے قربانی کی تاریخ، قربانی کا طریقہ، قربانی کے لیے مطلوب پیمانۂ اخلاص واخلاق وکردار اور پھر قربانی کو نتیجہ خیز بنانے کا ہنر بھی ہے اور قربانی کی مقبولیت کا تذکرہ بھی، یہ کتاب ہی نہیں دستاویز ہے، یہ کتاب مہمیز کرنے، حوصلہ دینے، جرأت عطا کرنے کا ذریعہ ہے، یہ گفتار وکردار کو سنوارنے، حالات کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہونے کے بجائے ان کو سلجھا لینے والی بڑی دلآویز ودلکش کتاب ہے، اس میں بزرگوں کے تاثرات ہیں، اکابر کی طرف سے قاضی صاحب کو پیش کیے گئے خراج عقیدت کے گلہائے رنگارنگ ہیں، دینی تعلیمی کونسل کی کامیاب تاریخ ہے، قاضی صاحب کی پرکشش، موثر اور تڑپا دینے والی تحریروں کا انتخاب ہے، مختصراً بس یہ کہیے کہ یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔

اس کے مرتب گرامی قدر جناب ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے سرِ ورق پر ''**مجاہد آزادی، نامور صحافی، تحریک خلافت کے علمبردار، اردو کے معتبر اور مخلص ترین قافلہ سالار مسلم یونیورسٹی کے عظیم فرزند، اس کے اقلیتی کردار کی حفاظت اور مطالبے کے پرجوش داعی، دینی تعلیمی کونسل کے بانی، ماہر تعلیم، ممتاز مورخ، دین وشریعت، زبان وتہذیب، ملی تشخص اور غیرت ایمانی کے ساتھ زندہ رہنے کی آواز بلند کرنے والے ملی رہنما، سیاسی مدبر، قوم وطن کے خاموش خدمت گذار قاضی محمد عدیل عباسیؒ (۱۳/مارچ ۱۸۹۸ء - ۲۲/مارچ ۱۹۸۰ء) کی روشن، بیباک، جرأت وجسارت سے بھرپور تحریروں کا پچاس سالہ انتخاب ''جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے۔**''

اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی دوچند ہوجاتی ہے کہ اس کی اشاعت ایک ایسے وقت میں ہوئی ہے جبکہ ملت اسلامیہ ہند بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے، بلکہ ایک طبقہ نے تو اپنی غیر ایمانی فکر کے باعث حالات سے تقریباً سمجھوتہ کر رکھا ہے، اور کچھ مایوس نفوس وہ ہیں جو حالات کو جاں کنی کی حالت سے تعبیر کر رہے ہیں، آزادی کے بعد کی صورت حال بعینہ ایسی ہی تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک وہولناک تھی، ملک ہی نہیں تقسیم ہوا تھا بلکہ دل بھی تقسیم ہوگئے تھے، عصمتیں پامال ہوئی تھیں، جائدادیں لٹی تھیں، گھر اجڑے تھے، خاندان کے خاندان تاراج ہوئے تھے اور یہ مناظر ملک کے کسی ایک علاقے میں نہیں بلکہ پورے ہندستان کے طول وعرض پر دیکھے گئے تھے، فرقہ وارانہ منافرت آگ اگل رہی تھی، کانگریس میٹھا زہر پلا کر سلا دینا چاہتی تھی، ہمارے اکابر مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش میں دو خیموں میں تقسیم تھے، اور پھر جمعیۃ العلماء کے کانگریس کے ساتھ مل کر تحریک آزادی چلانے میں بھی دو نقطۂ نظر تھے، آزادی کے متصلا بعد جو صورت حال پیش آئی اس نے اچھے اچھوں کو حواس باختہ کر دیا، درویشوں کو خانقاہوں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا، مدرسین کو سوچنے پر مجبور کر دیا، زبان کا مسئلہ تھا، مذہبی تشخصات کا مسئلہ تھا، اس ملک میں ملت کی بقا کا مسئلہ تھا، ۳۲ دانتوں کے درمیان تنہا زبان کے مصداق اس قوم کی صحت وسلامتی کا مسئلہ تھا، نئی نسلوں کے ایمان وعقیدے کی حفاظت کا مسئلہ تھا، نئے سرے سے اپنی پیروں پر کھڑے ہونے کا مسئلہ تھا، مختصراً یہ کہیے کہ اس نازک وقت میں زندگی کو بچا لینے Survive کرنے کا مسئلہ درپیش تھا، مگر ایسے مخلصین تھے جو ''نشانِ راہ'' دکھانے کا آہنی عزم رکھتے تھے، جو دینی تعلیم کی اہمیت

سے واقف تھے، جن کے یہاں سیاسی بصیرت اور فکر وتدبر کے سوتے پھوٹتے تھے، جنھوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ حالات کا مقابلہ شروع کیا اور ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کو حوصلہ دیا، آج ایسا لگتا ہے کہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو جو سفر ہم نے جہاں سے شروع کیا تھا گھوم پھر کر وہیں پہنچ گئے ہیں، مایوسی اور خوف وہراس کی اس صورت حال میں ایک مومن قلم سے نکلی ہوئی یہ سطریں پڑھیے جو ہمارے فکری، دینی اور ملی احساسات کی نہ صرف ترجمان ہیں بلکہ ان میں ہمارے لیے تعلیم وتلقین ہے، عبرت ہے، نصیحت ہے، ملاحظہ کیجئے اور ایمان کی چنگاری کو شعلہ بننے دیجئے: **''ہم نے جمہوریت کو بطور پالیسی بالکل اسی طرح تسلیم کیا ہے، جس طرح ۱۹۲۰ء میں عدم تشدد کو، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم اسلام کے بنیادی عقائد سے دستبردار ہوجائیں گے، ہندستان کے دستور اساسی کی حیثیت ایک ایسے معاہدے کی ہے، جو مختلف قوموں کے درمیان ہوا اور اس کی دفعہ ۲۹، ۳۰ واضح طور پر یہ حق دیتی ہے کہ ہم اپنے مذہب پر پوری آزادی سے عمل کرسکیں، ہم پھر بتادینا چاہتے ہیں خدا، اس کے رسول اور قرآن سے ہماری وفاداری پہلے ہے اور دستور کی وفاداری دوسرے درجہ کی، اس لئے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم سے یہ مطالبہ کرے کہ ہم حکومت کے وفادار رہیں، مسلمانوں سے اس قسم کے مطالبات جو انہیں اسلام ہی سے خارج کردیں، دستور میں دیے ہوئے حقوق سے بغاوت ہے۔'' (تحریر بے عدیل، ص ۲۳۴)**

جرأت رندانہ کے سبب قرطاس پر ابھرنے والی ان سطروں کے لکھنے والے بے باک قلمکار کی حوصلہ افزائی ادیب بے نظیر حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے یوں کی تھی: **''محترم عدیل عباسی یقیناً داد ومبارکباد کے مستحق ہیں کہ آوازۂ منصور کے خاموش ہوجانے کے عرصہ کے بعد اب از سرنو ''جلوۂ دار ورسن'' کو دعوت دی ہے''۔ (تحریر بے عدیل ص ۲۳۴)**

ان حالات میں مومنانہ بصیرت وجرأت کا مظہر یہ اقتباس بھی پڑھیے: **''ضرورت ہے کہ ہم اس نازک موقع پر اپنا موقف واضح کردیں، اور جہاں یہ ظاہر کریں کہ ہم ہندوؤں، عیسائیوں، پارسیوں اور ہندستان کے دوسرے باشندوں کے ساتھ مل کر ایک قوم ہیں وہاں یہ بھی بتلادیں کہ ''ہم ایک قوم اور ایک کلچر'' کے نظریہ کو اپنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں، ہم ایک ایسے عالمگیر تہذیبی سرمایے کے وارث ہیں جو اپنے اندر سب کچھ رکھتا ہے اور جو پروانے کی صفت نہیں رکھتا، جو روشنی کا جویا ہو، بلکہ جگنو کی طرح ہے جو سراپا روشنی ہے، اس لئے ہم طواف شمع سے آزاد ہیں اور اپنی فطرت کے تجلی گاہ میں آباد رہنے کو ضروری تصور کرتے ہیں، ہمیں ہر قیمت پر اپنی اسلامی تہذیب کو وطن دوستی اور قوم پروری کی پوری پابندی کے ساتھ زندہ رکھنا ہے، مگر طوفان اتنا تیز، بادِ مخالف کے جھونکے اتنے سخت اور گرادبِ بلا کا اتنا زور ہے کہ اس کے قیام کے لئے ہمیں بہت پختہ عزم اور نہایت دانشمندانہ شعور پیدا کرنا ہوگا۔'' (الفرقان مئی ۷۱ء ص ۱۳)**

قاضی صاحب کو حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے آستانے سے ''بے عدیل'' کا جو خطاب ملا اس کو انھوں نے نہ صرف سنبھال کر رکھا بلکہ اس کی معنویت کو ثابت بھی کر دکھایا، اپنے خلوص، اپنے کام کرنے کے انداز، اپنے جذبۂ ایثار وقربانی، پس پردہ رہ کر کام کرنے کے سلیقے نام ونمود سے پرہیز، منصب ودولت کی حرص سے بُعد اور اپنی بے باکی وجرأت رندانہ، اپنی تدبیر وفراست اور دل پذیر تحریروں میں واقعی ماضی قریب میں، وہ ''بے عدیل'' ہی بن گئے، ہم مرتب کتاب کی اس حسرت میں برابر کے شریک ہیں:

''وہ درد و سوز کا حامل وہ شارح اقبال
کہاں سے ڈھونڈ کے لائے زمانہ قاضی عدیل''

سچی بات یہ ہے کہ اگر میں اس کتاب پر بہت اختصار کے

ساتھ اپنے تاثرات قلمبند کروں تو کم از کم ندائے اعتدال کا ایک شمارہ تو درکار ہے، اس لیے تفصیل سے قطع نظر یہاں میں اس کے ابواب کی جھلکیاں دکھانے اور بالخصوص دینی تعلیمی کونسل والے باب پر اظہار خیال کرنے پر اکتفا کروں گا۔

یہ کتاب ۶۰۰ اصفحات پر مشتمل ایک تاریخی اور تاریخ ساز دستاویز ہے، جس میں ۱۴/ ابواب ہیں، پہلے باب کا عنوان ''شخصیت اور خدمات کا ذکر خیر ہے'' یہ ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے، لیکن ان ۱۵۰ صفحات میں جن اہل قلم کے مضامین شامل ہیں وہ قاضی صاحب کے معاصرین بھی ہیں، احباب بھی اور امت کے اکابر بھی اور قاضی صاحب کے محترم رفقاء بھی، ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی محبت آمیز اور سراپا اعتراف بن کر لفظوں میں ڈھل جانے والی تحریر بھی ہے اور مولانا محمد منظور نعمانی کا چشم کشا بلکہ بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والا، قاضی صاحب کے جوہر قابل کا بھرپور اعتراف کرنے والا مضمون بھی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور حکیم عبد القوی دریابادی سے لے کر جمیل مہدی، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ تک معتبر اہل علم وفن کی ایسی وقیع تحریریں اس باب میں شامل ہیں، جنھیں پڑھ کر ایک شخص نہیں، ایک عہد کی علمی، فکری، ملی اور سیاسی تاریخ کا اندازہ ہوتا ہے، اس باب کے مطالعہ سے قاضی صاحب کا جو سراپا بنتا ہے وہ نہایت خوبصورت، باکردار، باہمت، باحوصلہ اور خلوص وجہدِ مسلسل کا پیکر نظر آتا ہے۔

دوسرا باب ص ۱۵۱ سے ۲۲۸ تک ۷۸ صفحات پر مشتمل ہے، جس کا عنوان ہے ''یادِ ایام سلف'' اس باب میں قاضی صاحب کے ان مضامین وتاثرات کو جمع کیا گیا ہے جو انھوں نے خدا ترس علماء، بعض غیر مند دانشوران ملت اور نمائندہ شخصیات کے متعلق قلمبند کیے تھے، ان مضامین کو پڑھ کر ان کی مذہب پسندی اور خدا ترسی کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس باب کے آخر میں ان کی بعض انگریزی تحریریں بھی شامل ہیں۔

تیسرا باب اس کتاب کا سب سے قیمتی، زریں اور درخشاں باب ہے، ۳۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، ساتھ میں حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا ایک بیش قیمت مضمون ''قرآن عظیم اور جدید تعلیم'' بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

اس باب کو آپ اس ضخیم مجموعہ کا خلاصہ سمجھئے، بلکہ حاصل کتاب اور کتاب کا مغز شمار کیجئے، یہ باب قاضی صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ، ذخیرۂ آخرت اور عظیم کارنامے کی تاریخ و تفصیل پر مشتمل ہے، دینی تعلیمی کونسل کیا ہے، اس کی ان حالات میں کیا اہمیت وافادیت تھی، وہ کیسے پھلی پھولی، کس طرح اس نے مختصر عرصہ میں بلا تفریقِ مسالک ومشارب سب کے دلوں میں جگہ بنائی، اس کے بانی کا اضطراب کس درجہ کا تھا، ان کی حکمتِ عملی کیا تھی، کس طرح ہزاروں خود کفیل مکاتب چل پڑے، آگے چل کر یہی مکاتب، مدارس کے وجود کا سبب بنے ورنہ مدرسوں کا رخ کرنے والے طلبہ کہاں تھے، کس طرح لاکھوں بچے ان مکاتب سے جڑ گئے، یہ تحریک کس طرح اردو کی وکیل اور اردو کی سب سے بڑی عوامی تحریک بن گئی، ان سوالوں کا جواب پانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ ان ۳۰۰ صفحات کا ضرور مطالعہ کیجئے، ان صفحات کے مطالعہ سے آپ پر اس انقلابی کام کی اہمیت وضرورت کھلے گی، اس تحریک میں نئی روح پھونکنے کا عزم جنم لے گا، کام کرنے کا طریقہ سمجھ میں آئے گا، مسلمانوں کو تعلیم یافتہ، محافظِ اقدار اور اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کا سراہا تھ آئے گا، پھر آپ یہ تجزیہ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ اس شمع کی لو مدھم کیوں پڑی، اس کی رفتار سست کیسے ہوئی، اب کیا کرنا چاہیے اور کیسے کرنا چاہیے، واقعہ یہ ہے کہ یہی وہ بافیض تحریک ہے جس کی فیض رسانی سے لوگ بڑے بڑے تجارتی اداروں کے مالک بن گئے اور ایمان وعقیدے کی محافظ اس انقلابی تحریک کو منجدھار میں چھوڑ

گئے، وہ زندہ ہے مگر اسے نئی زندگی کی ضرورت ہے، اس کے خاکستر میں چنگاری ہے مگر اسے شعلہ بنانے کی ضرورت ہے، وہ اگر تازہ دم ہوجائے تو بہت سارے مسائل کا حل مل جائے۔ مرتب کتاب کے الفاظ میں اس باب میں اس تحریک کے متعلق ''ماضی کا دردناک منظر نامہ، حال کی ضرورت، خوبصورت مستقبل کی بازیافت، روحانی زندگی سے بھر پور خوابوں کی تعبیریں'' ملیں گی۔

یہاں ہم اس انقلابی تحریک کا مفصل تعارف تو نہیں کرا سکتے مگر کچھ ایسے اقتباسات ضرورت پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے اس کی انقلابی شان، اہمیت وافادیت اور اس کی پوری آب وتاب کے ساتھ ضرورت پر روشنی پڑتی ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ **''اس سلسلہ میں وہ استاد تھے اور ہم سب شاگرد، انھیں کے چونکانے سے ہم سب چونکے اور ہم سب نے یہ سفر شروع کیا۔ اس کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ضرورت ہے کہ لوگ اس کو بالکل ایک وقت کا اہم ترین تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھ لیں یہ حفاظتِ ملت کا کام ہے، یہ ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری ملت کا کام ہے کہ وہ ارتداد کا شکار نہ ہوجائے، اعلیٰ درجہ کے ثواب کا کام ہے، میں ایک بڑے دینی مرکز (ندوہ) میں اس کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے بڑھ کر صاف کہہ رہا ہوں آپ کے سامنے کہ یہ اس وقت تقرب الی اللہ کا اور رضائے الٰہی کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے اور وقت کا یہ افضل ترین جہاد اور دعوت ہے''** (تحریر بے عدیل، ص ۲۳۱)

مولانا محمد منظور نعمانی اس میں اپنے حصے پر ناز کرتے ہوئے یوں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں: **''مسلمان بچوں کی دینی تعلیم اور ان کے ایمان وعقائد کے تحفظ کی اس تحریک میں اپنے حصے کو میں اللہ کی ایک بڑی نعمت سمجھتا ہوں اور اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے موجود ذمہ داروں اور کارکنوں کی ہر طرح مدد فرمائے اور یہ نہایت ضروری کام اطمینان بخش پیمانے پر جاری رہے''** (تحریر بے عدیل، ص ۲۳۱)

اس تحریک سے ملک کے علمائے ربانیین کو کیسا تعلق خاطر تھا، اس کے وجود سے انھیں کیسا اور کس قدر احساس مسرت تھا، اس کا اندازہ قاضی صاحب کی اس تحریر سے لگائیے:

''مولانا علی میاں، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ہاں مقیم تھے، اور ضلع دینی تعلیمی کانفرنس بنارس کا اجلاس ہونے والا تھا، مولانا علی میاں اسی فکر میں تھے کہ کس عنوانِ شائستہ سے اجازت کی درخواست کریں، کہ حضرت نے خود مولانا کو تنہائی میں طلب کیا، مولانا نے سوچا کہ سلوک کے بارے میں کچھ باتیں کریں گے، مگر بخلاف اس کے حضرت نے اس امر پر اپنی بے چینی کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں کس طرح مسلمان رہ سکیں گی۔ مولانا علی میاں کو موقعہ مل گیا، انھوں نے تحریک کو مختصر لیکن وضاحت سے بیان کیا اور کہا کہ اسی لئے مجھے بنارس بھی جانا ہے، حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب اس یقین کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کروں گا کہ ہماری آئندہ نسلوں میں اسلام کے زندہ رہنے کا سامان ہوگیا اور گرم جوشی سے کہا کہ ضرورت جانیے اور زادراہ بھی عنایت فرمایا۔'' (تحریر بے عدیل، ص ۲۳۲)

یہ تحریک کس طرح پروان چڑھی اور کامیابی کے منازل طے کرتی چلی گئی، اس بابت مفکر اسلام مولانا علی میاںؒ کی یہ شہادت ملاحظہ کیجئے: **''ضلع بستی اور گورکھپور میں ایک شخص (قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم ومغفور) کی کوشش اور مقصد کے عشق نے بیسیوں اداروں کا کام کیا اور ہمیں اس نئے تجربہ سے آشنا کیا ہے کہ ایک شخص کا عزم اور اس کی حکمتِ عملی کس طرح عمومی چندہ سے بے نیاز ہوکر سیکڑوں مدرسوں کو چلا سکتی ہے اور کس طرح چھوٹے چھوٹے دیہات اور قصبات اپنے بچوں کی تعلیم میں خود کفیل ہوسکتے ہیں۔ خدا کے فضل سے ابھی بیسیوں مقامات پر**

ایسے صاحب عزم وصاحب درد مسلمان موجود ہیں جو اگر اس مہم کو لے کر کھڑے ہوجائیں اور اس کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیں اور اس کو اعلیٰ درجہ کی عبادت اور دینی خدمت تصور کریں تو یہ مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہوجائے لیکن شرطِ اول عزم اور شرطِ ثانی نظم ہے اور ان دونوں کی موجودگی ہر مشکل کو آسان اور ہر ناممکن کو ممکن بناسکتی ہے'' (تحریر بے عدیل، ص ۲۳۰)

اپنا احتساب کرنے کے لیے قاضی صاحب کی یہ سطریں بھی پڑھ لیجئے جو نہ صرف ہم کو دعوت احتساب دیتی ہیں بلکہ کسی بھی تحریک کی کامیابی کی ضمانت دیتی ہیں اور خود دینی تعلیمی کونسل کے کامیاب سفر کے راز سے پردہ اٹھاتی ہیں، قاضی صاحب کا یہ امتیاز تھا کہ وہ ہمیشہ پیچھے رہ کر کام کرتے تھے اور دوسروں کو آگے بڑھاتے تھے، وہ لکھتے ہیں: **''میں دینی تعلیمی کونسل کا ایک رضا کار ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔ ہمارے علماء نے بتایا ہے کہ اس تحریک میں کام کرنا نفلی عبادتوں سے زیادہ باعثِ ثواب ہے، میرا اس پر بھر پور یقین ہے جو کچھ کام میں اس میں کرتا ہوں یہ سمجھ کر کرتا ہوں کہ یہ میرے لئے باعثِ نجات ہے۔ میں نے دیکھا کہ وقت وہ آیا کہ صوفیا اپنے حجرۂ عبادت سے، صاحبان درس و تدریس اپنی مسند درس سے اور مصنفین اپنے تصنیفی گوشوں سے نکل پڑے اور اس میدان میں کام کرنے کے لئے آگئے اور میں نے غور کیا کہ جب یہ حال ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وقت کا تقاضہ کیا ہے اور ہم عام آدمیوں کا کیا فرض ہے۔''** (تحریر بے عدیل، ص ۳۳۵)

اس تحریک کی کامیابی کے راز کو سمجھنے کے لئے، قاضی صاحب کی فکر، ان کے عزم اور ان کے اہداف زندگی کو سمجھنا ضروری ہے، اور ان کو سمجھنے کے لئے شاید صرف یہ اقتباس پڑھ لینا کافی ہے، وہ کہتے ہیں: **''میری زندگی کے دو بڑے نصب العین ہیں، خدمتِ اسلام وخدمتِ حریت، ایک کا تعلق عام انسانی برادری سے ہے اور دوسرے کا تعلق وطن یا ہندوستان سے ہے۔ بہ حیثیت ایک مسلم میرا یہ ناقابل تسخیر عقیدہ ہے کہ اصولِ اسلام کے اندر نہ صرف ارواحِ انسانی کی نجات مضمر ہے بلکہ دنیا کے تمام مشکل مسائل کا حل موجود ہے۔ تمام دیگر مذاہب کی طرح مذہبِ اسلام کا بھی ایک عظیم کلچر ہے، جس کے بغیر میرے عقیدے میں انسانیت بہ حیثیت انسانیت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے اس کلچر کا اس طرح زندہ رکھنا کہ اس پر کسی قسم کا جبر عائد نہ کیا جائے اور نہ اس کی پرامن و پرسکون تبلیغ میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کی جاسکے۔ ہمارا ایک عظیم مقصد ہے۔ اس تحفظ کے بعد بیرونِ حکومتِ برطانیہ سے کامل آزادئ وطن کا حاصل کرنا ہمارے فرایض سے ہے۔ درحقیقت ان دونوں چیزوں میں کسی قسم کا تصادم نہیں ہے۔**

آزادئ وطن فرایضِ اسلامیہ کا ایک جزو ہے اور غلامی حرامِ مطلق ہے۔'' (تحریر بے عدیل ص ۵)

اس کم علم طالب علم نے اگر اپنے شدید تاثر کی بنا پر اس کتاب کو ملی اور تعلیمی وسیاسی کام کرنے والوں کے لیے، ان کے ذہن وفکر وکردار کی تعمیر وتشکیل کے لئے، ابتدائی نصاب قرار دے دیا تو واقعہ یہ ہے کہ سوچ سمجھ کر قرار دیا، جو بھی اس کتاب کو پڑھے گا وہ ہمارے دعوے کی دلیل بن جائے گا، یہاں اس تکرار کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی اس کو مکمل نہ پڑھ سکے تو کم از کم ان پرخطر حالات میں اپنے دین وایمان کے تحفظ وبقا کے لئے اس تیسرے باب کا مطالعہ واجب سمجھے۔

اس کے بعد چوتھا باب ''اردو تاریخ، تحریک، مسائل اور تجاویز'' کے عنوان سے قائم ہے جو ص ۵۴۵ سے ص ۷۱۲ تک پھیلا ہوا ہے، یہ باب بھی قاضی صاحب کی حق گوئی، بے باکی اور بصیرت سے عبارت ہے، اس باب کو پڑھ کر ان کو اردو کا مخلص ترین مجاہد اردو لکھنا ہرگز غلط نہیں، لوگ انھیں کانگریسی کہتے اور لکھتے ہیں اور وہ تھے بھی، مگر انھوں نے اس وابستگی کی پرواہ کیے

بغیر'' کانگریس کی اردو کشی'' پر جو تیر ونشتر چلائے ہیں، وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، مسائل سے بحث کرتے ہوئے اس باب میں قاضی صاحب نے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ قریب المیعاد بھی ہیں اور طویل المیعاد بھی لیکن وہ سب کی سب اردو کی بقاء و تحفظ کے لیے بڑی اہم اور ان کی بصیرت کی غماز ہیں، انھوں نے فی الحقیقت اس زبان سے عشق کیا، اس کے لیے اپنا خون جگر پیش کیا اور ساری عمر اس کی خاطر عملی جدوجہد کرتے رہے۔

پانچواں باب ''ماہنامہ صبح ادب لکھنؤ میں شائع شدہ مضامین'' کا مجموعہ ہے، ان مضامین میں ادب کی چاشنی کے ساتھ معلومات کا خزانہ ہے، صاحب قلم کی بے باکی کے ساتھ دار ورسن کی کہانیاں اور ایسی سچائیاں ان صفحات میں بکھری پڑی ہیں جن سے عزم وہمت کی ایک بے مثال داستان سامنے آتی ہے اور جنونِ عمل کو مہمیز لگتی ہے، اور یہ بات بھی خاص توجہ طلب ہے کہ قاضی صاحب کی تحریریں قلب ودماغ کو یکساں طور پر اپیل کرتی ہیں، ان کا اسلوب سحر طراز ہے، سچائی اور بے باکی کا لفظ لفظ شاہد ہے، وہ جو لکھ گئے بس ان ہی کا حصہ تھا، **یہ انداز، یہ اسلوب اور یہ جرأت اس کے حصے میں آتی ہے جو کشتیاں جلانے کا جذبہ رکھتا ہو، جو آہ سحر گاہی کی لذت سے آشنا ہو، جو غارت گرِ باطل ہونے کا متمنی ہو، جس کی نظر عقابی ہو اور جو ''شاہیں بناتا نہیں آشیانہ'' کے راز سے واقف ہو، یہ سچائیاں اسی کے نوک قلم سے ٹپکتی ہیں جو آداب عشق کی سوزش میں تپ کر کندن ہو چکا ہو، باب سمیٹوں تو بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ گویا ان کی تحریریں واقعی فکر اقبال کا نثری قالب ہیں۔**

چھٹا باب ''مسلم یونیورسٹی کی صالح روایات'' پر مبنی ہے، یہ وہ سلسلۂ مضامین ہے جو ہفت روزہ ندائے ملت لکھنؤ میں ۲۹ نومبر ۱۹۶۳ء تا ۲۰ مارچ ۱۹۶۴ء تک جاری رہا، یہ بڑا قیمتی حصہ ہے اس کتاب کا، کیوں کہ یہ خود راقم سطور کی دلچسپی کا باعث ہے، ایک مرتبہ برادرم اویس سنبھلی سے اس سلسلہ کو دوبارہ راقم کی ادارت میں نکلنے والے رسالے ''ندائے اعتدال'' میں شائع کرنے کی بات ہوئی تھی، لیکن یہ سلسلہ شروع ہونے سے قبل معلوم ہوا کہ یہ مضامین بھی اس مجموعہ کی زینت بن رہے ہیں، مگر اب بھی میری خواہش ہے کہ اگر مرتب کتاب اس کی اجازت دیں تو ان زریں مضامین کو وابستگان مسلم یونیورسٹی کے لیے پھر شائع کیا جائے، کیوں کہ یہ علی گڑھ یونیورسٹی کے اس سپوت کے قلم سے نکلے ہیں جو واقعی سرسید کے خوابوں کی تعبیر تھا، جس نے واقعی مسلم یونیورسٹی کے لیے عملی جدوجہد کی تھی، **جو اس کی اسلامی حیثیت کا چشم دید اور اس کے احیاء کا پرزور داعی تھا، ان مضامین کو پڑھ کر ہر صاحبِ احساس بس ایک سرد آہ کھینچے گا، اور کہے گا خدایا اس دانشگاہ کو کس کی نظر لگ گئی جہاں اسکالر نہیں انسان ڈھلا کرتے تھے، جہاں محض تعلیم نہیں ثقافت کے جام پلائے جاتے تھے، جہاں مشینیں نہیں خدمت گزار تیار کیے جاتے تھے، اب تو خود پرستی اور شکم پروری کا دور دورہ ہے، ہوس کے پجاری روز اس کی پیشانی پر کلنک کا نیا ٹیکا لگا دیتے ہیں، اقدار وروایات نے تو بالکل دم ہی توڑ دیا ہے بس ٹکے ٹکے کی رٹ ہے، وہ شعور جو اس دانشگاہ میں تقسیم ہوا کرتا تھا وہ پیٹ کے بندوں اور روح سید کے تاجروں کی نذر ہو گیا، اب تو شعور کی جگہ تجارت نے اور پروفیشلزم نے لے لی،** ایک مرتبہ میں طلبہ یونین کے ایک ''نیتا جی'' سے محوِ گفتگو تھا، اور ملی حالات پر وہ تبصرے فرما کر اپنے کرب کا اظہار فرما رہے تھے، کچھ عرصہ بعد جب ان سے کچھ عملی کام کی بات ہوئی تو یوں گویا ہوئے کہ ''ڈاکٹر صاحب ان سب کوششوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، میں تو سیاست میں بس اس لیے ہوں کہ کسی طرح ایک مرتبہ ودھایک بن جاؤں، اور پھر عیش کاٹوں''، ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اب ملت کا غم کھا کھا کر موٹے ہوتے ہیں، اور موٹاپا بھی ایسا ویسا نہیں بلکہ اس کے سبب

شوگر تک میں مبتلا ہوجاتے ہیں، جب ملی شعور کے بجائے ایسی سطحی سوچ ملت کے جوانوں میں پنپنے لگے تو پھر کیا ہوگا امت مرحوم کا، کہاں ہیں قاضی صاحب جیسے با صفا دیوانے جو تجدید عہدِ وفا کے لئے سامنے آئیں اور ملت کے اس حساس ادارے بلکہ بقول مولانا علی میاں ''ہندستانی مسلمانوں کے اس قلب'' کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیں اور قاضی صاحب کے ان مضامین کو پرانے علیگیرین اپنی آنکھوں کا سرمۂ اعتبار بنانے کے ساتھ نئی نسل کو کسی بھی طرح پڑھائیں مگر ضرور پڑھائیں، یہ سنہرا باب ص ۸۲۳ سے شروع ہوکر ص ۸۸۰ پر تمام ہوتا ہے۔ جو ناعاقبت اندیش اس متاع عزیز کو محض ایک اسکول، ایک تعلیمی ادارہ سمجھتے ہیں، جو اسے محض حیوان کا سب تیار کرنے کا ذریعہ سمجھ کر اپناتے ہیں اور پھر اس میں فساد مچاتے ہیں، ان کی نذر قاضی صاحب کا یہ حقیقت پسندانہ تبصرہ کرتا ہوں جس سے شاید ان کے دل پر چوٹ لگے، شاید اس سرمایۂ ملت پر انھیں کچھ ترس آجائے، قاضی صاحب نے تو صرف ایک دشمن جماعت کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اب تو اس مادر درسگاہ کی اپنی اولادیں جنھوں نے اس کی چھاتی سے دودھ پی کر اپنے پاؤں سے چلنا سیکھا اب اس کے لاغر جسم کا خون بھی چوس لینے پر اور اس کے جسم کو نوچ لینے پر آمادہ ہیں، قاضی صاحب اس ادارہ کی تاریخی حیثیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہندستان میں ایک مضبوط جماعت ایسی بھی تھی جو مسلمانوں کے وجود کو برداشت نہیں کرنا چاہتی تھی ان کا کہنا تھا کہ جب مسلمانوں نے ملک کا بٹوارہ کرلیا تو اب یہاں کیوں رہیں اور اگر رہیں تو ہندو بن کر رہیں، اپنا مذہب و کلچر ترک کردیں، دستور نے مسلمانوں کو یہ حق دیا تھا کہ وہ اپنی زبان، مذہب اور کلچر کی تمامی خصوصیات کے ساتھ عام شہریوں کے تمام بنیادی حقوق لیکر اطمینان اور آسائش سے رہیں، لیکن یہ طبقہ اس کا مخالف تھا چنانچہ اس نے توڑ پھوڑ، مارکاٹ، آتش زنی، بلوہ فساد کے ساتھ ساتھ مسجدوں کو مندر بنانے قبرستان کو کھود ڈالنے تک کے کام شروع کئے۔ یہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا نشان بھی باقی نہ رہ جائے جس سے پتہ چلے کہ کبھی یہاں مسلمان آباد تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان کی زد سے کیسے بچ سکتی تھی جو مسلمانوں کے کلچر کا ایک واضح نشان تھی، چنانچہ ان لوگوں نے علی گڑھ پر طرح طرح کے اتہامات لگا کر اور مختلف طریقوں سے اس کے اقلیتی کردار کو بدلنے کی کوشش کی اور وہ کوشش اب تک جاری ہے۔'' (تحریر بے عدیل، ص ۹۱۳)

اس کے بعد ساتواں باب ''مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بنیادی اور قانونی بحث'' کے عنوان سے ہے، اس کے مشتملات کے متعلق مرتب کتاب کے ان جملوں سے صد فیصد اتفاق ہے:

''جس میں مادرِ علمی سے محبت کی سرشاری بھی ہے، دستور ہند کی پاسداری بھی ہے، جرأت و جسارت کی آئینہ داری بھی ہے، اخلاقی رواداری بھی ہے، ادب وانشا کی زرنگاری بھی ہے، مسائل پر دلائل کے ساتھ گرم گفتاری بھی ہے۔'' (تحریر بے عدیل، ۸۸۱)

پھر آٹھواں باب ''مسلم پرسنل لا'' سے متعلق ہے، یہاں بھی قاضی صاحب کی قوت استدلال، جرأت اظہار، تجزیاتی انداز نمایاں نظر آتا ہے، یہ تحریریں بھی شریعت کے تحفظ کے جذبہ سے سرشار نظر آتی ہیں، اس ملک میں پرسنل لا کے تحفظ کے لئے قاضی صاحب کا جرأت مندانہ اظہار اور ایک حقیقت کی طرف اشارہ دیکھیے: ''کسی اعتراض یا نکتہ چینی سے مرعوب نہ ہونا چاہیے بلکہ جو بات کہی جائے وہ صرف کتاب وسنت کی روشنی میں کہنی چاہیے اور جو بات بھی پیش کرنی ہو اس پر مختلف الخیال علماء کا اجماع ضروری ہے اس اجماع و اتفاق کے بغیر کسی قسم کا قدم اٹھانا مناسب نہ ہوگا۔'' (تحریر بے عدیل، ۹۷۲)

آج کل بھی پرسنل لا کے مسائل حکومت نے چھیڑ رکھا ہے، ان حالات میں ذرا قاضی صاحب کے یہ حقیقت پسندانہ

اقتباسات ملاحظہ کیجئے: ''کبھی وہ دن تھے کہ علماء کا حکومت پر بڑا اثر تھا وہ حکومت خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ عوام علماء کے فتووں کو واجب التعمیل سمجھتے تھے اور علماء کے احکام پر ہر قسم کی قربانی پیش کر دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ آج علماء اور عوام میں ایک خلیج پیدا ہوگئی ہے اس میں عوام بے شک قصوروار ہیں اور بہت سے مادی اسباب نے ان میں یہ لا پروائی پیدا کی ہے، لیکن حضرات علمائے کرام بھی شاید بالکل بری الذمہ نہ قرار دیئے جاسکیں۔''

''حضرات علمائے کرام کو اس مسئلے پر بھی غور کرنا چاہیے اور اگر حکومت پر اثر انداز ہونا ہے تو عوام سے وہی گہرا ربط پیدا کرنا ضروری ہے اور وہ کیسے ہوسکتا ہے اسے حضرات علمائے کرام خود سمجھ سکتے ہیں۔'' (تحریر بے عدیل، ص ۹۷۲)

مجھے کہنے دیجئے کہ آج کل کے بالخصوص نوجوان علماء کے لیے اس باب کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے، اس باب کے مقدمہ نگار نے صحیح لکھا ہے کہ یہ تحریریں ''مسلم پرسنل لا کے موضوع پر وقیع اور گراں قدر اضافہ ہیں''۔

نواں باب ''سفرنامہ حج'' پر مشتمل ہے، جس کی تلخیص مرتب کتاب نے کی ہے اور جس پر بعض بزرگوں کے تاثرات ہیں، اس باب کی تحریروں میں قاضی صاحب کا قلم کیفیت وعقیدت میں جھومتا نظر آتا ہے، سطر سطر سے عبدیت کا مظاہرہ ہوتا ہے، ایمان ویقین کی چنگاریاں چمکتی نظر آتی ہیں، سچ پوچھیے تو یہ چند صفحے ذوق وشوق کی جوت جگانے کو بہت ہیں۔

پھر ص ۱۱۱۳ سے ''رویت ہلال کا اہم مسئلہ'' یعنی دسواں باب شروع ہوتا ہے، درحقیقت یہ قاضی صاحب کا ایک گراں قدر علمی استفتاء ہے جس کا مفصل جواب مولانا عتیق احمد فرنگی محلی نے دیا ہے، اس باب کے مقدمہ نگار نے اس استفتا اور فتوی کو علمی وفقہی سوغات'' قرار دیا ہے۔

اس کے بعد گیارہواں اور بارہواں باب بالترتیب ''تاریخ ترکی پر ایک اچٹتی ہوئی نظر'' اور ''تحریک خلافت'' پر مشتمل ہے، گیارہواں باب اس بارہویں باب کی تمہید ہے، ان دو ابواب کا مطالعہ فکر ونظر کے اختلاف کے باوصف دلچسپی سے خالی نہیں، ان دونوں ابواب میں فکر ونظر کو جلا بخشنے والے نوادرات بڑی عرق ریزی کے ساتھ مرتب نے جمع کر دیے ہیں، قاضی صاحب کی مشہور تصنیف ''تحریک خلافت'' پر جو نقد وتبصرے ہوئے ہیں انھیں مع وضاحتوں اور جوابات کے جمع کیا ہے، ان ابواب میں قاضی صاحب کے نقطۂ نظر سے اختلاف کی پوری گنجائش موجود ہے، اس میں قاضی صاحب بھی بڑی حد تک آخر میں اس نتیجہ پر تو پہنچے ہیں جس کو بعد میں بڑی وضاحت سے ہندستان کے مایہ ناز انشا پرداز بلکہ ہند میں بسیرا کرنے والے عندلیب حجاز مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پیش کیا ہے، مرتب کی سلیقہ مندی کہیے کہ انھوں نے مولانا کے اقتباسات کو کشید کر یہاں اس طرح جمع کر دیا ہے کہ مسئلہ واضح ہوجائے، قاضی صاحب کا وہ اقتباس جس سے ان کے اس نقطۂ نظر کی قدرے وضاحت ہوتی ہے جو قابل طعن نہیں، پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کردوں کہ عالم اسلام میں مسیحا بن کر اٹھنے والے لیڈران میں مصطفیٰ کمال ہی نہیں جس سے اچھے اچھے لوگ دھوکہ کھا گئے ہوں بلکہ یہی حال تقریبا مصر وشام وعراق وایران سے ابھرنے والے لیڈروں کے ساتھ رہا ہے، ہاں کچھ سیماب صفت ہمیشہ رہے ہیں جن کی نظریں در پردہ فریب کو بھی بھانپ لیتی ہیں، بہرحال یہاں ہم قاضی صاحب کے اس اقتباس کو پیش کیے دیتے ہیں جو ان سے اس مسئلہ میں اختلاف کرنے والوں کے لئے بھی تسکین کا باعث ہے اور یہ ثابت کر دیتا ہے کہ فکر ونظر کا اختلاف کسی غیور کی دینی حمیت کو مغلوب نہیں کرسکتا: **''۳/مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا اور ترکی**

دیگر حکومتوں اور سلطنتوں کی طرح ایک دنیوی حکومت رہ گئی۔ اس واقعہ نے ہندستان میں غم وغصہ کی ایک لہر دوڑا دی اور وہی مصطفیٰ کمال جو مسلمانوں کا اب تک ہیرو تھا لعن وطعن کا نشانہ بننے لگا۔

ترکوں نے اگر چہ اپنے دستور میں یہ لکھ دیا تھا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہوگا لیکن صرف اتنا لکھ دینے سے تو کچھ نہیں ہوتا جس نہج پر انگورہ کی حکومت چل رہی تھی اس سے یہ اندازہ کر لینا چنداں دشوار نہ تھا کہ اب وہاں کی حکومت اسلامی حکومت نہ ہوگی۔ مثلاً بہ یک جنبش قلم دینی امور اور اوقاف کی وزارتیں موقوف کر دی گئی۔ اوقاف کا صیغہ وزارتِ مال کے سپرد کر دیا گیا اور دینی تعلیم کا انتظام وزیر تعلیم کے سپرد کر دیا گیا۔ قدیمی دینی مدارس جو قسطنطنیہ اور دیگر شہروں کی مساجد میں قائم تھے توڑ دئے گئے۔

صرف اس لیے کہ حکومت ترکیہ کے سربراہ مسلمان تھے، ترکی اسلامی حکومت نہیں ہوسکتی تھی چہ جائیکہ خلافت جس کا اصل کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے''۔ (تحریر بے عدیل، ص ۱۲۷۸)

اس کے بعد تیرہواں باب ''فکر ونظر کے مختلف موضوعات'' کے عنوان سے ص ۱۳۱۹ سے شروع ہوتا ہے، اس باب میں بھی مرتب کتاب نے مختلف رنگ کے حسین پھول جمع کر دیے ہیں اور جب کئی رنگ کے پھول یکجائی ہوں تو پسند و ناپسند میں معیار نظر کا کمال ہوتا ہے، جس طرح گزشتہ باب میں مصطفیٰ کمال کی تعریف وتوصیف بہرحال طبیعت پر بارِ گراں تھی اسی طرح اس باب میں بھی جمال عبدالناصر سے متعلق تحریروں نے پھر سے اس دعوے کو صادر کر دیا کہ جب ''نوامری عربی نہ ہو'' تب براہ راست کسی عربی اور خالص اسلامی مسئلہ پر اظہار خیال ہمیشہ صائب ہی نہیں ہوتا، کاش جمال ناصر نے ملت اسلامیہ کا جو حشر کیا اور عرب اسرائیل جنگ کے جو نتائج مرتب ہوئے اور پھر جو تحقیقات واسباب بے شمار لوگوں نے سپرد قلم کیے ان کو سامنے رکھ کر قاضی صاحب نے اپنے موقف کا دوبارہ جائزہ لیا ہوتا، یہاں بھی قاضی صاحب کا جذبۂ خالص صاف نظر آتا ہے، لیکن فکر کی غلطی بہرحال قلم سے چمٹ گئی، شاید یہ عقدہ ان پر نہ کھلا تھا کہ یہ جنگ نہیں بلکہ ناصر واسد اور مغربی طاقتوں کا مفاہمتی کھیل تھا، جس کا عنوان بڑا خوشنما تھا، قاضی صاحب اسرائیل کی فتح پر کبیدہ خاطر ہوئے، خوب ماتم کیا مگر اسباب کا صحیح تجزیہ نہ کر سکے اور کیا مجال کہ جمال ناصر کی کوتاہی پر انگلی رکھی ہو، اس جنگ کا نتیجہ فتح اسرائیل اور عربوں کی غلامی پر منتج ہوا۔ فکر ونظر کے اس اختلاف کو اس زاویہ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ قاضی صاحب چونکہ بڑے زبردست نیشنلسٹ تھے، کانگریس کے وہ رکن رکین بھی تھے اور کانگریس کی بخیہ دری بھی کرتے رہتے تھے، ان کا نظریہ تھا کہ ان سے لڑنا بھی ہے اور ان سے منہ بھی نہیں موڑنا، نیشنلزم کی علمبرداری کے سبب وہ جمال عبدالناصر کو آخر تک ہیرو مانتے رہے، اسرائیل کی فتح پر ماتم تو کیا لیکن ناصر کی غلطی کیسے تسلیم کرتے، نہرو کی ناصر سے بڑی گہری دوستی تھی، یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب کیا اس وقت کے تمام ہی کانگریسی علماء ناصر کی قومیت عربیہ کے جاہلی نعرے کو نظر انداز کر کے اسے عربوں کا نجات دہندہ اور مصلح اعظم سمجھتے رہے، لیکن اس بحث میں قاضی صاحب کا ایک اعتراض طاقت ور تھا کہ آخر سعودیہ کی سلطانی پر تنقید کیوں نہیں کی جاتی، کیا سلطانی کا جواز ہے، سچ ہے کہ آل سعود کی جس طرح ہندستانی مسلمانوں نے خدمت حرمین کے نتیجہ میں پذیرائی کی اس کا خمیازہ اب بھگتنا پڑ رہا ہے، البتہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیشہ سعودیہ کو خطاب کرتے ہوئے وہی ناصحانہ رخ اختیار کیا جو قلندروں کا طریق رہا ہے، ترجیحات کی تعیین وتخییر ایک الگ مسئلہ ہے اس کے سبب فکر ونظر کا اختلاف کوئی برائی نہیں۔

لیکن سچ پوچھیے تو سب سے دلچسپ اس باب کے آخر میں پیش کردہ وہ اقتباسات ہیں جو مرتب نے بڑی جسارت کے ساتھ

ان کی مطبوعہ ذاتی ڈائری ''آئینہ شب وروز'' سے منتخب کر کے ص ۱۴۲۵ تا ۱۴۲۷ شامل اشاعت کر لیا ہے، ان اقتباسات میں بھی ان کی دینداری، حمیت و غیرت ایمانی، فکر مندی و شعورِ ملی نمایاں ہے، آج کل کے حالات کے پیش نظر یہ اقتباس مفید ہی نہیں اکسیر ہیں، کیوں کہ ادب اختلاف، ایک دوسرے کا احترام، جذبۂ باہمی، وضعداری ورواداری ان اقتباسات کی جان ہے، اسی غرض سے کچھ حصے یہاں شامل کیے جاتے ہیں:

''میری تقدیر میں ان دنوں غم ہی غم ہے، آرام، اطمینان اور سکون مفقود ہے، بین الاقوامی معاملے میں سرائیل کی فتح اور اس کے لاف وگزاف سے کلیجہ چھلنی ہے، ذاتی معاملہ میں پریشانیاں حد سے زیادہ ہیں، الغرض میں ان دونوں استقلال و استقامت سے دور ہوتا جارہا ہوں، دو تین دن سے عصر بعد لوگ آجاتے ہیں اور تلاوت قضا ہوجاتی ہے۔ جب کہ تلاوت ہی باعثِ سکونِ قلب رہتی ہے اور اس سے ڈھارس پیدا ہوجاتی ہے۔''

''میں کبھی خلیج پیدا نہیں ہونے دوں گا۔ میرا مطالبہ صرف آزدئ رائے کا ہے جس کا میں بچپن سے عادی ہوں، مولانا علی میاں کے گروہ سے میرا گہرا اختلاف ہے لیکن کوئی خلیج نہیں ہے، ابھی ابھی ان لوگوں کے خلاف مضمون دے کر آیا ہوں لیکن محبت خلوص اور دینی تعلیمی تحریک میں ساتھ ساتھ کام کرنے میں فرق نہیں ہے۔''

مولانا علی میاں رائے بریلی سے لکھنؤ واپس آئے، میں حرارت میں مبتلا تھا لیکن بعد مغرب ان سے ملنے گیا۔ مولانا کی وضع داری میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ کوئی شکن ان کی جبیں پر نہیں تھی یہ تعریف کی بات ہے۔''

مولانا علی میاں کا خط ملا۔ لکھا ہے کہ رمضان میں رائے بریلی میں رہیں گے، دو ایک دن کے لئے رائے بریلی چند دوستوں کے ساتھ بلایا ہے تاکہ تحریک پر گفتگو ہوسکے۔''

آج طبیعت مضمحل رہی بے ثباتی عالم کا نقشہ سامنے ہے، ہر چہار جانب ہُو کا عالم ہے، چاہتا ہوں افق کے پار چلا جاؤں جہاں انسان ملیں اور انسانی قدروں کے قدرداں ملیں، زندگی بے کیف ہے، ملک تباہی کی طرف جارہا ہے۔ اخلاقی گراوٹ کی کوئی حد باقی نہیں ہے، مسلمانوں کے مسائل روز بروز الجھتے جاتے ہیں اور بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں، خاندانوں کے باہمی برتاؤ کے اصول ہی بدل گئے ہیں۔ زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے۔ جدھر نظر ڈالو۔ عرب اسرائیل جنگ میں ہمارے جن سنگھی بھائی عربوں کو گالیاں دے رہے ہیں۔ مسلمانوں سے بغض حد تک پہنچا ہوا ہے اور اسی منزل تک ظلم آرائیاں ہیں۔'' (تحریر بے عدیل، ص ۱۴۲۷)

چودھواں اور آخری باب قاضی عدیل عباسی کے نام اکابر ملت کے خطوط اور بعض تأثراتی مضامین پر مشتمل ہے جو انتہائی دلچسپ اور مفید ہے، بالخصوص اس میں انگریزی زبان میں قاضی صاحب کا خود نوشت سوانح پر دیباچہ دلچسپ ہے، اور سب سے آخر میں عرض مرتب ہے، یہ ''عرض'' نہیں احساسات کی شمع ہے جس کی روشنی یہاں تو ص ۱۵۷۳ تا ۱۶۰۰ پھیلی ہوئی ہے مگر کتاب سے ہٹ کر دیکھیں تو یہ عرض پروانے کی وارفتگی ہے، غواص کے صدف تلاش لینے کا ہنر ہے، بادبان کے کشتی کو ساحل سے ہمکنار کرنے کا فن ہے، اس ''عرض'' میں جذبات کی متلاطم موجیں ہیں، ذوق کی جلوہ آرائی ہے، زبان و بیان کی موروثی چاشنی ہے، مگر ''اکابرین'' کے استعمال کی خوبصورت خطا فصیح اللسان مرتب بھی کر بیٹھے ہیں، اس کلیات عدیل کو اگر مرتب کتاب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، جبکہ وہ اس سے پہلے بھی متعدد بیش قیمت چیزیں پیش کر کے اہل ذوق کا دل جیت چکے ہیں، مگر اس کتاب میں تو انھوں نے جواہر پاروں کے انتخاب، بے حد مفید

اقتباسات اور جگہ جگہ اقبال کے اشعار کو جس طرح جمع کیا ہے وہ واقعی قابل داد ہے، ضعف اور امراض سے گھرے ہونے کے باوجود کیا کچھ نہ جمع کر دیا ہے اس کتاب میں، **علم وادب، تذکرہ و سوانح، تاریخ وتحریک، دین وسیاست کا اگر بہترین مرقع دیکھنا ہو تو اس سے بہتر اور کون سی کتاب ہوسکتی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ اس تحفۂ بیش بہا کو پیش کرنے پر کس طرح ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی صاحب کا شکریہ ادا کیا جائے اور کس طرح انھیں مبارکباد دی جائے، اس لیے کہ اس کا ہر مضمون تازہ نظر آتا ہے، جہاں سے کھول کر پڑھیے یوں لگتا ہے کہ بس آج کی صورت حال کے لئے رہنمائی مل گئی،** بروقت اس کتاب کی آمد پر بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسعود الحسن صاحب کو صحت وعافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے اور اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے، اب تو یہ کلیات زینت مکتبات ہے مگر جناب مرتب سے یہ التماس ہے کہ اس کو کم از کم دو جلدوں میں از سر نو شائع کر دیں تا کہ مطالعہ آسان وممکن ہو، اس کے بعض اجزاء کو علیٰحدہ شائع کر کے عام کر دیں تو شاید بازگشت کو سننے والے کچھ لوگ میسر آجائیں۔

ممکن ہے قارئین کو راقم کی طوالت کے سبب زحمت اٹھانی پڑی ہو، مگر واقعہ یہ ہے کہ جب راقم نے قلم اٹھایا تو خود کو بے اختیار پایا، اور یہی وجہ ہے کہ یہ سطریں میرے دوسرے مضامین سے قدرے الگ رنگ نظر آئیں گی، جس کا اصل سبب قاضی صاحب کی بے باک ومخلص ذات ہے، جس کی شہادت ہر ہر صفحۂ کتاب پر بکھری پڑی ہے، ان کے اخلاص کی شہادت ان کے رفیق گرامی قدر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے یوں دی ہے: **''راقم سطور جس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کا طالب علم تھا قاضی صاحب اس وقت روزنامہ ''زمیندار'' لاہور کے ایڈیٹر تھے جو اس دور کا سب سے زیادہ مقبول، مؤثر مسلم روزنامہ تھا۔ راقم سطور کا تعلق ان سے قریباً ۳۰۔۳۲ سال سے تھا، میں نے ان کے طبقہ میں کوئی دوسرا آدمی نہیں دیکھا جس میں دین وملت کا ایسا درد اور کام کی ایسی لگن ہو۔ دینی تعلیم کے مکاتب کا جو نظام انھوں نے قائم کیا اس کے نتیجے میں ہزاروں مکاتب قائم ہیں، ان کے فکر وعمل کا ایسا شاہکار ہے جس پر مستقل کتاب لکھی جائے۔''** (تحریر بے عدیل)

میں نے بہت چاہا کہ اس مضمون میں اختصار کے ساتھ سراپا کھینچ سکوں اور اس کتاب کی اشاعت پر قاضی صاحب کو خراج عقیدت پیش کر سکوں لیکن میری کیا بساط کہ اختصار یا اطناب کے ساتھ حق ادا کر سکوں کیوں کہ ان کے انتقال پر حضرت مفکر اسلامؒ نے یوں لکھا تھا:

''میں کس قلم اور کس زبان سے اپنے مخدوم وشفیق بزرگ قاضی صاحب کی تعزیت کروں، یہ حادثہ محض ایک خاندان کا حادثہ نہیں ہے، ملت کا حادثہ ہے.....''

قاضی صاحب ساری عمر قربانیاں پیش کرتے رہے کیوں کہ وہ محض قلمی تنقید اور نکتہ چینیوں کے عادی نہیں تھے، بلکہ بڑھ کے ہاتھ میں بینا اٹھا لینے کا حوصلہ رکھتے تھے، نئے دور کے آغاز اور اس کے تقاضوں کے محرم راز تھے، اپنے خون جگر کی چھینٹوں سے ملک وملت کو سیراب کرتے رہنا ان کی فطرت میں شامل تھا، مختصر یہ کہ وہ ساری زندگی وہی کرتے رہے جس کا مطالبہ دوسروں سے کرتے تھے۔

دل جوش میں لا، فریاد نہ کر، تاثیر دکھا تقریر نہ کر

ان کی زندگی جس طرح جوش وخروش اور پرازتاثیر رہی واقعہ یہ ہے کہ ان کی سوانح اور خدمات پر مشتمل یہ مجموعہ بھی کسی بادۂ نشاط انگیز سے کم نہیں، اس میں روح کی تسکین قلب کی فرحت وحرارت اور ایمان کی تازگی کا سامان بہم موجود ہے، بڑے پیمانے پر اس کی اشاعت ہونی چاہیے اور ملی وسماجی کارکنوں کو اس سے خوب خوب استفادہ کرنا چاہیے۔

☆☆☆

❑ قضیۂ فلسطین

بیت المقدس اور مسجد اقصی

حقائق اور صہیونی وعالمی سازشوں کے آئینہ میں

مجیب الرحمان عتیق ندوی

مسجد اقصی انبیاء علیہم السلام اور خدا کے برگزیدہ بندوں کے ذریعہ خدائے واحد کی بندگی کے لئے قائم کیا ہوا قدیم مرکز ہے، اس کو اسی لئے قائم کیا گیا کہ توحید کا زمزمہ اس کے مناروں سے بلند ہو، خدائے بزرگ وبرتر کی کبریائی کا اعلان ہو، چنانچہ مسجد اقصی کے درودیوار، منبر ومحراب اس کے شاہد عدل ہیں کہ مختلف زمانوں میں انبیاء علیہم السلام نے اس کو آباد کیا ہے، توحید وحق کا نعرہ لگایا ہے، اسی طرح بیت المقدس معلوم تاریخ انسانی کے مطابق ایک قدیم ترین ایسا شہر ہے، جو اپنی جغرافیائی خصوصیات، زرخیزی وشادابی، قدرتی حسن وجمال میں ممتاز ہے، جہاں اس شہر کو انبیاء وصلحاء وشہداء کا مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے، وہیں یہ علاقہ ظاہری حسن وجمال سرسبزی وشادابی کے ساتھ بہت سی روحانی برکتوں سے مالا مال ہے، قرآن مجید نے اس کو ارض مقدس یا برکت والی زمین کا خطاب دیا ہے، زمانہ قدیم سے ہی بہت سی انسانی جنگوں کے تانے بانے اسی شہر سے ملتے ہیں، مسجد اقصی کے درودیوار مختلف زمانوں میں ظالموں کے ظلم اوران کی چیرہ دستیوں کے شاہد رہے ہیں، اسی ظلم وبربریت کی تاریخ کا ایک باب یہ ہے کہ آج سفاک زمانہ اسرائیل نے اس سرزمین پر ناجائز قبضہ کرکے اپنی تاناشاہی کا اعلان کیا ہے، اور وہاں کے اصل باشندوں پر بہیمانہ ظلم وتشدد کی وہ تاریخ رقم کی ہے کہ ظلم وسفاکیت بھی شرما جائے، فلسطین میں اسرائیلی حکومت کا قیام عالمی استعماری طاقتوں کے دجل وفریب کا نمونہ ہے، یہود نے حقائق کو اس طرح مسخ کیا، اور اپنی طاقت وقوت کے بل پر ایسی سازشیں کی ہیں کہ آج بہت لوگ یہ سمجھنے لگے کہ فلسطین میں یہودیوں ہی کا حق ہے، فلسطین کی جنگ ایک قومی وعلاقائی جنگ ہے، بلکہ اب تو حیرت یہ ہے کہ قدس اور مسجد اقصی سے دست برداری کا خیال بھی بعض لوگوں کو پیدا ہونے لگا ہے، اور وہ یہ کہنے لگے ہیں کہ مسجد اقصی کے تحفظ کے لئے انسانی جانوں کی قربانی درست نہیں ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کی حکومت عالمی سازشوں کا ایک حصہ اور یہود کے دجل وفریب کا کارنامہ ہے، مسجد اقصی وفلسطین کی جنگ صرف عقیدہ وایمان کی جنگ ہے، مسجد اقصی عرب یا اہل فلسطین کی میراث نہیں بلکہ پوری امت اسلامیہ کے پاس انبیاء کی امانت اور حق وشوکت کا نشان ہے، اس پر جغرافیائی، تاریخی، دینی ہر اعتبار سے یہود کا دعوی دھوکہ وفریب کے سوا کچھ نہیں۔

اسرئیل کی باقاعدہ حکومت کا اعلان ۱۹۴۸ء میں ہوا، تاہم اس کی تیاری وکوششیں بہت پہلے سے موجود تھیں، عالمی صہیونی تحریک (World Zionist Movment) کی کوششوں

اور سازشوں کے ذریعہ عربوں کے قلب سرزمین فلسطین میں اسرائیل کا مقصد ایک عالمی صہیونی ریاست کا خواب ہے، جس کی سرحدیں نیل سے فرات تک وسیع ہیں، جدید صہیونیت کے بانی تھیوڈر ہرزل نے اپنی کتاب (The Jewish State) ۱۸۹۶ء میں شائع کی اور اس میں مملکت صہیون کا خواب پیش کیا ،اس مملکت کے قیام کے لئے ۱۸۹۷ء میں ہرزل نے سوئزر لینڈ میں یہودی دانشوروں کی ایک کانفرنس منعقد کی، جس کا مقصد یہ تھا:

۱-تمام یہودیوں کو صہیونی فکر پر متحد کیا جائے

۲-فلسطین کی طرف تمام یہودیوں کو ہجرت کی دعوت دی جائے، بلکہ اس پر آمادہ کیا جائے۔

۳- فلسطین کو عالمی برادری سے یہود کے قومی وطن (Jewish State) کے طور پر منظور کرایا جائے۔

یقیناً یہ مقاصد اس وقت ایک ایسی قوم کے لئے جس کی کوئی حیثیت یا وزن نہیں تھا، محض ایک خواب سے زیادہ نہ تھے، لیکن جس مکر وفریب اور دجل وتلبیس کا منصوبہ تیار کیا جارہا تھا وہ اتنا طاقتور تھا کہ یہود کو اپنے مقاصد کی تکمیل پر روز اول سے اتنا اعتماد تھا کہ صیہونیت کے بانی وصدر اول ہرزل نے اپنی ڈائری میں اس کے اختتام پر یہ نوٹ لکھا:

(Were I to sum up the Basel Congress in a word- which I shall gaurd against pronouuncing publicy - it would be this; At Basel I founded the Jewsih State, If I said out loud today I would be greeted by universal laughter, In five years perhaps, and certainly in fifty years everyone will perceive it.)

''اگر میں بال کانفرنس کے مقصد کو ایک لفظ میں بیان کروں تو یہ کہوں گا کہ آج صیہونی مملکت کی بنیاد رکھ دی گئی، یقیناً اگر دنیا کے سامنے یہ بات کی جائے تو لوگ مجھ پر ہنسیں گے، مگر ہم جس مملکت کا خواب دیکھ رہے ہیں، دنیا پچاس سال کے اندر اس کی حقیقی تعبیر دیکھے گی''۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد صہیونی تحریک کی کوششیں فلسطین میں یہودی مملکت کے قیام کے لئے تیز ہوتی چلی گئیں، ایک وفد ترکی خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی سے ملاقات کے لئے تھیوڈر ہرزل کی قیادت میں روانہ ہوا، سلطان سے یہ درخواست کی گئی کہ سرزمین فلسطین میں ہمیں کاشت کاری کے لئے کچھ زمین دے دی جائے، ہم بہت احسان مند ہوں گے، اور اس کے عوض ترکی کے سارے قرضے ادا کرنے میں تعاون کریں گے، سلطان عبدالحمیدؒ خلافت عثمانی کے آخری غیور وباحمیت سلاطین میں سے تھے، انہوں نے یہودیوں کے دام تزویر اور فریب میں آنے کے بجائے وہ جواب دیا جس کو آج بھی تاریخ پورے عز وناز کے ساتھ دہراتی ہے، سلطان نے فرمایا:

''ہم اس سرزمین کے ایک بالشت کا بھی سودا نہیں کریں گے، ہم اس سرزمین کی اپنے خون سے حفاظت کریں گے، یہ سرزمین میری ملکیت نہیں بلکہ پوری امت کی ایک امانت ہے''

سلطان کے اس تاریخی جواب کے بعد یہ وفد ناکام واپس آیا، مگر اس نے بھانپ لیا تھا، کہ اس سنگ گراں کو راہ سے ہٹائے بغیر ان کا خواب کبھی پورا نہیں ہوسکتا، یہودی خلافت عثمانیہ کے خلاف سازشوں کا جال تیار کرنے لگ گئے، ان کی کوششیں وسازشیں تیز سے تیز ہوتی چلی گئیں۔

۱۹۱۴ء میں دنیا پر حکمرانی کی ہوس اور ملک گیری کی خواہش میں عالمی استعماری طاقتوں کے درمیان خطرناک جنگ کا آغاز ہوا، جس میں ایک طرف جرمنی، ہنگری، آسٹریا، بلغاریہ اور عثمانی ترک تھے، جن کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا جاتا ہے، تو دوسری طرف برطانیہ، روس، سربیا، فرانس، اور امریکا کی اتحادی و مرکزی قوتیں (Centrel Powers) تھیں، اس ہولناک وخوں ریز جنگ کے بھیانک نتائج سامنے آئے، کروڑوں افراد موت کے گھاٹ تاردئے گئے، کروڑوں افراد لاپتہ ہوگئے، بڑے بڑے ممالک دیوالیہ ہوگئے، ۱۹۱۸ء میں جنگ کے خاتمہ پر مرکزی طاقتوں کا پلہ بھاری رہا، اور جرمنی وترکی کو اس کی بڑی قیمت چکانا پڑی، خلافت عثمانیہ کے بہت سے علاقے برطانیہ کے زیر تسلط آگئے، اس جنگ کے نتائج یہودیوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے، انہوں نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی سازشوں کے ذریعہ ۱۹۲۴ء میں باقاعدہ خلافت کا خاتمہ کردیا، اور ترکی میں ایک سیکولر حکومت قائم کردی گئی،

جنگ عظیم اول میں ترکوں نے برطانیہ وفرانس کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا تھا، اس لئے برطانیہ نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا، اور انہیں عرب خلافت کا خواب دکھایا، جس کے نتیجہ میں عربوں نے ترکوں سے بغاوت کا اعلان کردیا، یہودی سازشوں سے قومیت کی زہریلی جڑیں پھر سے ہری ہوگئیں، برطانیہ کے مکر وبد دیانتی اور ظلم وجبروت کے سیاہ صفحات کو سات سمندروں کے پانی سے بھی دھویا نہیں جاسکتا، ملکوں اور قوموں کے ساتھ اس کے استعمار وظلم اور بددیانتی سے تاریخ بھری پڑی ہے، برطانیہ نے ۱۹۱۶ء میں شریف مکہ حسین بن علی کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، جو عرب برطانیہ معاہدہ (Arab Britian Declaration) کے نام سے مشہور ہے، شریف مکہ حسین بن علی اور مصر میں برطانوی نمائندہ ''سر ہنری مکماہون'' (Sir Henry McMahon) کی خفیہ مراسلت کے ذریعہ یہ معاہدہ انجام پایا کہ اگر شریف مکہ ترکوں سے دست بردار ہوجائیں، اور ان کا ساتھ نہ دیں، تو برطانیہ عرب خلافت کے قیام میں ان کا تعاون کرے گا، یہ معاہدہ ایک سازش اور صرف دھوکہ تھا، اس کا مقصد عرب قومیت کو بیدار کرکے ترکوں کے خلاف انہیں میدان میں اتارنا تھا، ایک طرف جب برطانیہ عربوں کو ان کی حکومت وریاست کے خواب دکھا کر ان سے معاہدہ کررہا تھا، دوسری طرف برطانیہ اور فرانس میں مزید ایک خفیہ معاہدہ عربوں سے متعلق کیا گیا، جو برطانوی نمائندہ ''مارک سایکس (Marc Sykes) اور فرانسیسی نمائندہ ''جورج پیکوٹ'' (Georges Picot) کے ذریعہ پایہ تکمیل تک پہونچا، یہ معاہدہ بھی اسی سال ۱۹۱۶ء میں مکمل ہوا، اس معاہدہ کی رو سے عرب ممالک کو برطانیہ وفرانس اور روس کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا، برطانیہ نے شریف مکہ حسین بن علی کو عرب خلافت کا جو خواب دکھایا تھا، وہ دھوکہ ثابت ہوا، ان کے ایک بیٹے کو عراق اور دوسرے بیٹے کو اردن کا بادشاہ بنا کر اس خلافت کے خواب کو ختم کردیا گیا، جزیرۃ العرب میں آل سعود کی حکومت کی راہیں ہموار کرکے ان کو آگے لایا گیا، اس طرح عربوں کو ترکی کا حریف بنا کر خلافت کو قومیت کے بت پر قربان کردیا گیا، اور تمام سازشی اژدہے اپنے اپنے بلوں سے باہر آگئے، معاہدات ہوتے رہے اور عالم اسلام کی آبرو لٹتی رہی۔

برطانیہ کی بددیانتی وخیانت کا شرمناک پہلو یہ بھی ہے کہ ۲/نومبر ۱۹۱۷ء میں ایک اور معاہدہ یہودیوں کے ساتھ کیا، یہ

معاہدہ ''وعدہ بالفور''(Balfour Declaration) کے نام سے مشہور ہے،جس میں برطانوی وزیر خارجہ ''بلفور'' Arthur Jemes Balfuor) نے ایک یہودی نمائندہ'' والیٹر روتشیلڈ'' (Walter Rothschild) کے نام ایک تحریر کے ذریعہ فلسطین میں یہودیوں کے لئے قومی وطن بنانے کی اجازت دی ہے، یہ معاہدہ برطانوی تاریخ کی بددیانتی وخیانت کا سیاہ نشان ہے،جس میں اس نے ایک عرب ملک فلسطین ایک ایسی قوم کو دینے کا وعدہ کیا ہے،جس پر نہ برطانیہ کا کوئی قانونی حق تھا،اور نہ ہی یہودیوں کا،جس وقت برطانیہ نے فلسطین کی زمین پر یہودی وطن کے قیام کی منظوری دی تھی،اس وقت وہاں کے اصل باشندوں کی آبادی تقریبا ۹۲ فیصد تھی،مگر جمہوریت سب سے بڑے علمبردار ملک برطانیہ نے فلسطین کے عوام سے جمہوری اصول کے مطابق ان کے رائے لینا بھی مناسب نہ سمجھا،اوراس طرح انسانی واخلاقی ہی نہیں بلکہ جمہوری بنیادوں کا خون کرتے ہوئے یہود کو فلسطین میں قومی وطن بنانے کی منظوری دے دی، یہ اتنا ظالمانہ فیصلہ تھا کہ خود ایک ہنگری نژاد یہودی صحافی '' آرتھر کوئسٹلر'' (Arther Koestler) نے اپنی کتاب (Promise and Fulfilment) میں لکھا ہے، (One nation solemnly promised to a second nation the country of a third nation) ''تعجب کی بات ہے کہ ایک قوم نے دوسری قوم کو ایک تیسری قوم کا ملک تحفہ میں دینے کا وعدہ کرلیا''۔

یہودی بلاخوف فلسطین میں اپنی آبادیاں قائم کررہے تھے، بھاری رقمیں دے کر فلسطینیوں کی زمینیں خرید رہے تھے،اگرچہ بہت سے فکرمندوں نے اس وقت خطرہ کو بھانپتے ہوئے اور سرزمین فلسطین کی اہمیت کی وجہ سے وہاں کے باشندوں کو زمینوں کی فروخت سے منع کیا،مگر زیادہ قیمت کے لالچ اور بے بصیرتی کی وجہ سے اس وقت کسی کو اس کا احساس نہیں ہوا، یہودیوں نے فلسطین پر قبضہ کرنے اور اپنی ریاست قائم کرنے کے خواب میں ہر حربہ استعمال کیا،اس وقت فلسطین برطانوی سامراج واقتدار کا حصہ تھا،اس لئے وہاں یہودیوں کو اور موقع تھا کہ ظلم وغنڈا گردی،لوٹ مار کے ذریعہ فلسطینیوں کو دہشت زدہ کرکے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کرتے تھے، یہودی گماشتے پوری آزادی کے ساتھ ظلم ودہشت کا ماحول گرماتے تھے،۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ نے فلسطین میں یہودی حق تسلیم کرتے ہوئے اس کے ایک حصہ پر یہودیوں کو اپنی حکومت بنانے کی قانونی آزادی دے دی، جنگ عظیم دوم کے بھیانک ترین نتائج وصورتحال کے بعد استعماری ملکوں کی کمر مزید ٹوٹ چکی تھی،لہذا اب برطانیہ نے فلسطین سے اپنے قبضہ کو ہٹانے کا فیصلہ کیا، برطانوی گورنر نے اقتدار یہود کے حوالہ کرکے وہاں سے رخت سفر باندھ لیا،مگر ساتھ ہی برطانیہ نے ۱۹۴۷ء میں واپس جانے سے پہلے فلسطین کی تقسیم کا بل اقوام متحدہ میں پیش کردیا،۲۶/نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کے اجلاس میں فلسطین کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا،صورتحال ایسی تھی کہ شاید تقسیم کا فیصلہ نہ ہوتا، یا یہود کے مفاد میں نہ ہوتا کیوں کہ ممکنہ ووٹ کا حصول نظر نہیں آرہا تھا،اس لئے خلاف قانون اجلاس کو چند دن کے لئے ملتوی کردیا گیا،امریکہ ،برطانیہ ،اور یہودیوں نے زبردستی، لالچ اور دھونس کے ذریعہ کچھ ممالک کو تقسیم کے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ کرلیا، چنانچہ نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کردیا،تقسیم کی رو سے فلسطین

کا ۵۵ فیصدی رقبہ ۳۳ فیصدی یہودی آبادی کو اور ۴۵ فیصدی رقبہ ۶۷ فیصدی عرب آبادی کو دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف چھ فیصدی حصہ یہودیوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوام متحدہ کا انصاف، جس کے ذریعہ صہیونی ریاست کے قیام کی مزید قانونی راہ ہموار ہوگئی، اس کے بعد یہود نے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کا باقاعدہ اعلان کردیا، اور عالمی استعماری طاقتوں نے اس ناجائز ریاست کو تسلیم کرلیا، اس کے بعد اسرائیل نے فلسطینیوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ دئے، بستیوں کی بستیاں اجاڑ دی گئیں، بے رحمی سے قتل کردیا گیا، صابرہ وشتیلا، دیر یاسین کی انسانیت سوز کاوائیاں کی گئیں، جن کی ظلم وبربریت کے متحمل الفاظ وتعبیرات نہیں ہوسکتے، ظلم وبربریت کا وہ ننگا ناچ دنیا کی نگاہوں کے سامنے ہوا اور ہورہا ہے، مگر کوئی اس وحشت وبربریت پر بولنے کی جرأت نہیں کرتا۔

سرزمین فلسطین پر موجودہ اسرائیلی ناجائز حکومت کا قیام یہودی سازش اور برطانوی استعمار کے فریب وظلم کا نتیجہ ہے، اس وقت سے آج تک یہ خنجر عربوں کے قلب میں پیوست ہے، اور اس سے خون رس رہا ہے، بلکہ شرق اوسط میں بدامنی واضطراب، فساد وخوں ریزی کا بہت بڑا سبب یہودی ریاست کا قیام اور اس کا تحفظ ونیل سے فرات تک اس کی سرحدوں کی توسیع ہے، فلسطین میں قتل وغارت اور ظلم وبربریت کے بارے میں ''ونسٹن چرچل'' (Winston Churchil) نے صاف اعتراف کیا تھا، اس نے جون ۱۹۲۱ء میں کہا تھا)

The cause of unrest in Palestine ,and the only cause arises from the Zionest Movement, and our promises and pladges in regard to it.) ''فلسطین میں فساد وبدامنی کا سبب صہیونی ریاست اور ہمارے وعدے ہیں''۔

پوری دنیا نے اس دھوکہ اور دھاندلی کو دیکھا کہ زبردستی ایک قوم کو ان کے وطن سے باہر نکال کر دوسری فسادی قوم وہاں کی مالک بن گئی، اصل باشندے اجنبی اور بیرونی حملہ آور قانونی باشندے بن گئے، یہود کے فسادی گماشتے اور مجرم ٹولے قانونی فوج اور اپنے وطن، عزت وآبرو کا دفاع کرنے والے باغی کہلائے، بے رحمی سے قتل کئے گئے، صحراء وبیاباں میں خانماں برباد ڈال دئے گئے، ظلم وستم کی وہ تاریخ دہرائی گئی جس کی مثالیں کم ملتی ہیں، یہودیوں کا اس سرزمین پر نہ جغرافیائی حق بنتا ہے، نہ قانونی، نہ مذہبی، مگر اس کے باوجود دنیا کی استعماری طاقتیں صرف اسرائیل کا اعتراف ہی نہیں کرتی ہیں، بلکہ اس کے قیام کی سازش میں شریک اور اس کے تحفظ کے انتظامات میں لگی ہوئی ہیں۔

فلسطین اور بیت المقدس کے بارے میں یہودیوں کا دعوی محض مغالطہ وفریب ہے، وہ یہاں کے اصل باشندے نہیں ہیں، قدیم تاریخی مآخذ، جدید تحقیقات اور تمام دنیا کے انسائیکلوپیڈیا اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اس سرزمین کے اصل باشندے کنعانی عرب (Cananites) ہیں، طوفان نوح کے بعد جو قومیں ''سامی اقوام'' کے نام سے مشہور ہیں وہ جغرافیائی اور نسلی طور پر عرب ہیں، ان کا اولین مسکن جزیرۃ العرب تھا، جس کی سرحدیں مشرق میں خلیج عقبہ اور فلسطین تک اور شمال مشرق میں نہر فرات تک پھیلی ہوئی تھیں، یورپین مورخین اگرچہ اس بارے میں اختلاف رائے رکھتے ہیں، لیکن اکثر قابل لحاظ مؤرخین کی یہی رائے ہے، جن میں ''ڈی خو'' (D.Goege) ''شریڈر'' (Sharader) ''نولڈیکی''

(Noldeky) ''ونکلر'' (Winkler)اور'' ڈاکٹر اسپرنگر'' (Dr.Springer)وغیرہ ہیں،اسی طرح انگریزی اسکالرس میں''کینی'' (Keane)''رابرٹ اسمتھ'' (Rabert Smith)اور''ولیم رائٹ''(W.Wright) بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں،(تاریخ ارض القرآن ۱/ ۱۰۷-۱۰۹)

یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ تقریبا تیرہ سو برس قبل مسیح میں اس علاقہ میں داخل ہوئے،اور طویل کشمکش کے بعد بالآخر وہ اس سرزمین پر قابض ہوگئے،اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں حضرت داؤدؑ،حضرت سلیمانؑ کے ذریعہ خداوند قدوس نے بنی اسرائیل کو نبوت وبادشاہت سے سرفراز کیا،ان کی متحدہ ریاست خدا کے حکم سے اس کے پیغمبروں کے ذریعہ قائم ہوئی،مگر بنی اسرائیل حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد زیادہ دن اس امانت کو نہ سنبھال سکے،آپس کی خانہ جنگی کا شکار ہوئے،اور پیغمبروں کی تعلیمات سے انحراف،خدا کی نافرمانی کی پاداش میں متعدد مرتبہ عذابوں کا شکار ہوئے،یہود کی سلطنت کے پانچویں سال سیسق شاہ مصر نے چڑھائی کی اور سب کچھ لوٹ لیا،اور یہود کو بے دخل کردیا،کتاب سلاطین میں ہے:

''اور رجعام بادشاہ کے پانچویں سال شاہ مصر سیسق نے یروشلم پر چڑھائی کردی اور اس نے خدا وند کے گھر کے خزانوں اور شاہی محل کے خزانوں کو لے لیا''(سلاطین اول۱۴/۲۵-۲۶)، اس کے بعد تقریبا ۴۰ ؁ق م میں آشوریوں نے یہود کو فلسطین سے بے دخل کردیا، پھر یہود کو سنبھلنے کا موقع ملا ہی تھا کہ ۵۹۷ ق م میں بخت نصر کا حملہ ہوا، اور اس خطرناک حملے میں توراۃ ضائع ہوئی،بہت سے یہودی قتل کئے گئے،اور ان کو بابل میں لے جا کر قید کردیا گیا،کتاب تواریخ میں ہے:

''صدقیاہ اکیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے گیارہ برس یروشلم میں سلطنت کی اور اس نے وہی کیا جو خداوند کی نظر میں برا تھا .....خدا وند کا غضب لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا، چنانچہ وہ کسدیوں کے بادشاہ کو ان پر چڑھا لایا جس نے ان کے مقدس گھر میں جوانوں کو تلوار سے قتل کیا،اور اس نے کیا جوان،کیا کنواری،کیا بڈھا یا عمر رسیدہ کسی پر ترس نہ کھایا،اور خدا کے گھر کے سب ظروف اور خداوند کے گھر کے سب خزانے اور بادشاہ اور اس کے سرداروں کے سب خزانے وہ بابل لے گیا،اور انہوں نے خداوند کے گھر کو جلادیا اور یروشلم کی فصیل ڈھادی اور اس کے تمام محل آگ سے جلادئے''(تواریخ دوم ۳۶/۱۱-۲۱)۔

اس حملے کے بعد ایرانیوں کے ذریعہ پھر ان کو فلسطین میں کچھ دن آباد ہونے کا موقع ملا،مگر یونانی اور ان کے بعد رومی تازیانہ خداوندی بن کر مسلط ہوئے،اور ان پر مظالم کئے،فلسطین سے بے دخل کردیا گیا،۷۰ ق-م میں طیطس رومی کا حملہ ہوا،جس میں لاکھوں یہودی قتل ہوئے،اور ہیکل مقدس کو جلادیا گیا،اس حادثہ کے ۶۵/سال بعد پانچویں مرتبہ قیصر ہڈرین کے عہد میں یہودیوں نے بغاوت کی،مگر شکست کھائی ،جس کی پاداش میں قیصر نے بدترین ظلم کیا،ہیکل کو تباہ کرکے اس کی جگہ ہل چلوادیا گیا،اور وہاں ایک مندر تعمیر کیا،شہر کا نام یروشلم سے بدل کر ایلیاء رکھدیا،اس میں پانچ لاکھ یہودی تخمیناً مارے گئے۔

یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ سرزمین فلسطین کے اصل باشندے نہیں تھے،جب بھی یہاں آکر آباد ہوئے،اپنی بغاوت وسرکشی،نافرمانی وعصیان،خدا کی اطاعت سے انحراف کے جرم میں قہر الٰہی کا شکار ہوئے،اور یہاں سے نکال دئے

گئے،اس سرزمین نے ان کو زیادہ دن قبول نہیں کیا،تاریخی اعداد وشمار کو دیکھا جائے تو مختلف زمانوں میں یہودی شمالی فلسطین میں صرف تقریبا چار پانچ صدی آباد رہے،اور جنوبی فلسطین میں ان کی مدت قیام زیادہ سے زیادہ آٹھ نوسو سال ہے،لیکن عرب اقوام شمالی فلسطین میں تقریبا ڈھائی ہزار سال اور جنوبی فلسطین میں تقریبا دو ہزار سال سے آباد ہیں۔

اسی طرح ماہرین لسانیات کے اعتبار سے سرزمین فلسطین اپنی ثقافت،زبان واداب،اور فطرت کے لحاظ سے عرب علاقہ ہے،یہود کا یہ دعوی کہ وہ فلسطین کے اصل باشندے یا قدیم باشندے ہیں،یا تاریخی وجغرافیائی کسی لحاظ سے ان کا حق بنتا ہے،محض ایک مغالطہ اور دجل وفریب کے سوا کچھ نہیں۔

یہودیوں کی تاریخ اور کتاب مقدس (Bible) کے صفحات گواہ ہیں کہ یہودی ایک خدا کی باغی ونافرمان قوم ہیں،انہوں نے خدا کی کتابوں کو بگاڑا،ان میں تحریف کی،خدا کے برگزیدہ بندوں اور پیغمبروں کی توہین کی،انہیں قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا،ان کا شیوہ توحید سے انحراف،بت پرستی،نسل پرستی،سرکشی وتمرد،بدترین اخلاقی جرائم،اور بے رحمی وسنگدلی رہا ہے،اسی لئے ان کو بار بار عذابوں اور مصائب میں مبتلا کیا گیا،وہ تاریخ میں کبھی سنبھلنے نہیں پاتے تھے،کہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے پھر گرفتار بلا ہوجاتے تھے،کتاب مقدس میں ان کو بار بار دھمکی دی گئی اور وعیدیں سنائی گئی ہیں،یہی وجہ ہے کہ اپنے پیہم جرائم وسرکشی،نافرمانی وبغاوت کی وجہ سے ذلت ومسکنت ان کا مقدر بن گئی،خدا کا یہ فرمان صادق آیا'' ضربت علیهم الذلة والمسكنة وباؤا بغضب من الله '' یہ زمین انسانوں کی ملکیت نہیں بلکہ خدا کی امانت ہے،قرآن مجید میں صاف بتایا گیا ہے کہ زمین کی امانت وواراثت خدا جس کو چاہے عطا فرماتا ہے،اور جس کو چاہتا ہے اس کے مجرمانہ کردار اور نااہلی کی وجہ سے محروم کردیتا ہے،یہود کو یہ امانت خدا کے پیغمبروں کے ذریعہ متعدد مرتبہ دی گئی مگر ان کی نااہلی،اور باغیانہ کردار نے ان کی شقاوت ومحرومی کی تقدیر لکھ دی۔

تاریخ سے یہ بات بالکل واضح ومبرہن ہے کہ یہودی ریاست (Jewish State) کا قیام سرزمین فلسطین پر ناجائز وغیر قانونی اور استعماری طاقتوں کے ظلم وفریب کا آئینہ دار ہے،جس وقت صہیونی ریاست کے قیام کا خواب دیکھا جارہا تھا،اور اس کے لئے صہیونی تحریک منصوبہ سازی کررہی تھی،ہرزل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے دو ملکوں میں سے کسی ایک کو نشانہ بنانے کا منصوبہ تھا،ارجنٹائنا یا فلسطین میں کسی ایک کے انتخاب کا مسئلہ تھا،بالآخر فلسطین کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس میں یہودی عوام کے لئے جاذبیت زیادہ ہے،اس سے ان کی قدیم تاریخ اور مذہبی جذبات وابستہ ہیں،عبرانی لٹریچر میں فلسطین کا نام دہرایا گیا ہے،ہرزل اپنی کتاب'' صہیونی ریاست'' (Jewish State) میں لکھتا ہے:

(Shall we choose Palestine or Argentine? We shall take what is given us, and what is selected by Jewish public opinion, The society will determine both these points.)

''ہم اپنے وطن کے لئے فلسطین کا انتخاب کریں یا ارجنٹائنا کا؟ یقیناً ہم اسی کو اختیار کریں جو ہمیں دیا گیا ہے،اور جو یہودی عوام کی رائے سے منتخب ہوا ہے'' اس کے بعد فلسطین کی وجہ

انتخاب اور ترجیح کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

(Palestine is our ever memorable historic home,The very name of Palestine would attract our people with a force of marvelous potency. If His Majesty the Sultan were to give us Palestine,we could in return undertake to regulate the finances of Turkey)

The Jewish State p 15, Translated from German by Sylvie D,Avigdor

''فلسطین ہمارے لئے ایک تاریخی اور یادگار گھر ہے، فلسطین کا نام ہماری قوم کے لئے بڑی کشش وجاذبیت رکھتا ہے، اگر سلطان ہمیں فلسطین دینے پر راضی ہوجاتے ہیں تو ہم اس کے عوض ترکی کے معاشی نظام کو مستحکم کرسکتے ہیں۔

جس غیر منصفانہ وغیر انسانی طریقہ سے سرزمین قدس پر اسرائیل کا قیام عمل میں آیا ہے، خود ایک یہودی مفکر'' البرٹ آئنسٹائن''(Albert Einstein) نے جنوری ۱۹۴۶ء کو یہودی ریاست کے بارے اپنے منفی رویہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

The State idea is not according to my heart. I cannot understand why it is needed. It is connected with narrow-minded and economic obstacles. I believe it is bad. I have always been against it.

Alfred M. Lilienthal, What Price Israel?, 50th Anniversary edition, 2003, pg. 130

''یہودی ریاست کے تخیل کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے، میں نہیں سمجھ پارہا ہوں کہ آخر یہودی ریاست کے قائم کرنے کی معقولیت اور وجہ کیا ہے، یہ صرف تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہے، میں ہمیشہ یہودی ریاست کا مخالف رہوں گا''۔

دنیا کے منصف مزاج جانتے ہیں کہ اسی تنگ نظری اور تعصب کی بنیاد پر قائم ہونے والے ملک نے حقائق کو کس طرح مسخ کیا ہے، اور انصاف وانسانیت کا خون کرتے ہوئے اپنی ناجائز ریاست قائم ہی نہیں کی ہے بلکہ پوری دنیا کو روندنے اور تمام اقدار وروایات، تہذیب ونظریات کو ختم کرکے صرف ''مملکت صہیون'' State of Zion کی توسیع کی کاروئیوں میں ہمہ تن مصروف ہیں، ۱۹۵۰ء میں اسرائیل کے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گورین نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''ہمیں جوش وخروش کے ساتھ جنگ جاری رکھنی ہوگی، یہ بیک وقت فوجی اور سیاسی جنگ ہوگی، ہمیں ایک بار پھر سلیمانؑ کے زمانہ کی سلطنت قائم کرنا ہے''، اسی نے ۱۹۵۱ء میں پارلیمنٹ کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی:

''ہمیں کوئی وسیع ملک نہیں ملا، بلکہ ہم ستر سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد اپنے ملک کے چھوٹے سے حصہ میں ابتدائی آزادی کی منزل میں داخل ہوئے ہیں''۔

اسی کا قول یہ بھی ہے کہ: ''یہودیوں کے لئے الگ سلطنت کا قیام صہیونیت کا واحد مقصد نہیں ہے بلکہ اسرائیل کے قیام کے بعد ہمارے لئے اپنی تحریک کو آگے بڑھانا ضروری ہوگیا ہے، اسرائیل کی حکومت صرف ایک وسیلہ ہے، منزل نہیں ہے''۔

سرزمین فلسطین میں یہودی وصہیونی ریاست کا قیام صرف ملکوں کی فہرست میں ایک نئے نام کا اضافہ نہیں ہے، بلکہ سازش وفریب، دھاندلی وغنڈا گردی کے ذریعہ انسانی وقانونی تمام حدود کو پامال کر کے ظلم کی تاریخ کا نیا باب ہے، اسی لئے اسرائیل کی کوئی سرحد متعین نہیں، نیل سے فرات تک اس کو وسیع کیا جائے گا، پوری دنیا کی معیشت وسیاست پر ان کا حکم جاری ہوگا، مسجد اقصی کو ختم کر کے ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہوگی، عالم عربی کے منافق حکمرانوں اور امراء کو اس وقت تک استعمال کیا جائے گا جب تک ان کی ضرورت ہے، یا بالفاظ دیگر جب تک اسرائیلی وصہیونی مفاد ان سے وابستہ ہے، یہ جنگ صرف سیاسی وجغرافیائی سرحدوں کی جنگ نہیں ہے بلکہ صہیونیت Zionism کی اسلام مخالف (Anti- Islam) جنگ ہے، یوں تو یہودی اپنے تلمودی افکار ونظریات کے تناظر میں تمام مذاہب بلکہ انسانی اقدار کے دشمن ہیں، تاہم فی الحال اس میدان میں ان کا بنیادی دشمن اسلام ہے۔

مشرق وسطی کی صورتحال کچھ اس کا اشارہ کر رہی ہے کہ خالص اہل اللہ کی جماعت، کفر ونفاق سے پاک اہل ایمان کا وہ طائفہ منصورہ، وسعت افلاک پہ تکبیر مسلسل کا حوصلہ رکھنے والے مردان خدا گاہ وخدا مست کا گروہ موجودہ ابتلاء ومحن، آزمائش ومصائب کی آگ سے نکھر کر سامنے آئے گا، جس کی پیشانی سے حق وصداقت کا نور ہویدا ہوگا، فتح وکامرانی عزت وشوکت، غلبہ واقبال مندی اس کا مقدر، اور ستارے اس کی گرد راہ ہوں گے، کفر اور کفر نواز منافقین، دجالیت کے علمبردار ایک صف میں ہوں گے، اور ''العاقبۃ للمتقین'' کا فیصلہ تقدیر صادق آئے گا، اور تمام باطل فریبی قوتیں بیت عنکبوت کی طرح صاف ہوں گی، صادق ومصدوق محمد عربی ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: ''لا تقوم الساعة حتى تقاتلوا اليهود، حتى يختبأ اليهودي وراء الحجر والشجر، فيقول الحجر والشجر، يا مسلم، يا عبد الله، هذا يهودي خلفي، فتعال، فاقتله، الا الغرقد'' (صحیح مسلم) ''قیامت نہیں قائم ہوگی، تآنکہ تم یہود کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کرو گے، یہاں تک کہ یہودی شجر وحجر کے پیچھے چھپیں گے، تو بے زبان درخت اور گونگے پتھر بھی پکاریں گے، اے مسلم! اے اللہ کے بندے،! میرے پیچھے یہودی چھپا ہے، آ اس کو قتل کر، تاہم غرقد نامی ایک درخت نہیں بولے گا''۔

یہود کی بدکرداری، بے دینی وانحراف خدا اور پیغمبروں سے بغاوت، اور مخالفت حق کی وجہ سے یقیناً وہ اس لائق ہیں کہ ان کو شجر وحجر بھی پناہ نہیں دیں گے، حق وصداقت کی فیصلہ کن جنگ میں خود یہودی سیل رواں کے مقابلہ ریت کی دیوار ہیں تو اس کے سایہ میں رہ کر اپنے عرش وکرسی، عیش وتنعم کی آرزو کرنا کتنی بڑی غلط فہمی ہے، آج شہر قدس کی پامالی اور ''مسجدِ اقصیٰ'' کی مظلومیت مسلمانوں کی غیرتِ ایمان سے جواب طلب کر رہی ہے کہ کیا اب صلاح الدین ایوبی کا حوصلہ، معتصم کی نخوت وغیرت، ایمانی حمیت قصہ پارینہ بن چکی ہے، یا اس خاکستر میں کوئی شرر ہے، جو اس کی مقدس فضاؤں کو نجات دلا سکے؟ صہیونت اور سانحۂ فلسطین کی پوری تاریخ اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ اس سلسلہ میں استعماری وعالمی طاقتوں سے نیکی کی توقع رکھنا فضول ہے۔

بڑھ سوئے بیت المقدس اپنا لہرانے علم
اے مجاہد! جادۂ دشوار کی پرواہ نہ کر

☆☆☆

❑ قضیۂ فلسطین

لالہ خونیں کفن، فلسطین اردو شاعری میں

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

غزہ پر اسرائیل کی جارحیت تمام حدود پار کر چکی ہے۔ عرب حکومتوں کی نادانی اور مسلمانوں کے ضعفِ ایمانی کی وجہ سے مسجدِ اقصیٰ کی بازیابی کا کام آج تک نہیں ہوسکا ہے۔ ایمان اگر طاقت ور ہو اور غیرت موجود ہو تو مقاومت اور معرکہ آرائی کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک قوم منزل مقصود تک نہیں پہنچ جاتی اور فتح مکمل نہیں ہوجاتی ہے۔ اسرائیل کے جنگی جرائم کی داستان خون چکاں ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ فلسطینیوں کے حوصلے پست کردیئے جائیں اور تمام عرب ممالک کیا مصر و شام، اور کیا پٹرول سے مالا مال عرب ملک سب کے سب بے کسی، بے بسی اور شکست خوردگی کی تصویر بنے ہوئے ہیں اور کچھ اس کے سواء نہیں کرسکتے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا اقوام متحدہ سے امن کے نام پر اپیل کریں۔ فلسطین کی بازیابی کی واحد راہ یہ ہے کہ ہم اقوام متحدہ، سلامتی کونسل، وائٹ ہاؤز پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں اور صرف اللہ پر بھروسہ کریں، ذوقِ یقین، شوق شہادت، باہمی اعتماد و اتحاد ہی وہ چیزیں ہیں جو کامیابی و فتح مندی کی کلید ہیں۔ ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ فلسطین کے لئے صلاح الدین ایوبیؒ جیسی کوئی شخصیت پیدا کردے جسے فلسطین پر غیروں کے قبضہ کا ایسا غم تھا، جیسے کسی کا اکلوتا بیٹا مرگیا ہو۔ عرب حکومتیں عیش و عشرت میں گرفتار اور ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہیں۔ فلسطین کا زخم دل کا داغ اور سینہ کا چراغ بن چکا ہے۔ شعراء جن کی طبیعتیں حالات سے جلد متاثر ہوتی ہیں، انہوں نے فلسطین کے قبضہ پر بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ ہم یہاں چند نظموں کے اقتباسات پیش کریں گے، جن سے اندازہ ہوگا کہ فلسطین کے قضیہ نے اُردو شاعری پر کیا اثر ڈالا ہے۔

علامہ اقبال نے فلسطین کے بارے میں عربوں سے مخاطب ہوکر ایک نظم کہی تھی:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
مَیں جانتا ہوں وہ آتش تیرے وجود میں ہے
تیری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے

''خودی کی پرورش اور لذت نمود'' یہ ہے اقبال کے نزدیک مسئلہ فلسطین کا حل۔ فلسطین کا مسئلہ جنیوا میں حل ہوسکتا ہے اور نہ لندن میں اور نہ تل ابیب میں۔ اقبال نے ایک سے زیادہ مقامات پر مسئلہ فلسطین کا تذکرہ کیا ہے اور اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انگریزوں کا اصل مقصد اسرائیل کی ریاست قائم کرکے عرب ملکوں کو مطیع اور زیر فرمان بنانا ہے، ورنہ اس دلیل میں کوئی وزن نہیں کہ ہزاروں سال پہلے یہاں یہودی رہا کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال کہتے ہیں:

ہے خاکِ فلسطین پر یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیتِ افرنگ کا کچھ اور
قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد ورطب کا

اسی طرح نظم ''تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سودخوار'' میں جو تیشے کے زیر اثر لکھی گئی ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ

یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام میں یہودی مہاجن بہت زیادہ طاقتور ہیں اور اس معاشی قوت کی وجہ سے سیاسی معاملات کی باگ ڈور بھی اُن کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ مسئلۂ فلسطین پر علامہ اقبالؒ نے جو بیان دیا تھا، وہ اقبال نامہ میں موجود ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

''فلسطین میں یہود کیلئے ایک قومی وطن کا قیام تو محض ایک حیلہ ہے، حقیقت یہ کہ برطانوی اِمپیریلزم مسلمانوں کے مقاماتِ مقدس میں مستقل انتداب اور سیادت کی شکل میں ایک مقام کی متلاشی ہے''۔

اقبال نے مسلمانوں کو بار بار قوت کے حصول کی نصیحت کی ہے۔ اقبال کے نزدیک کامیابی کسی کا پیدائشی حق نہیں ہے، کامیابی حاصل ہوتی ہے، خودی کو طاقتور بنانے سے، یقینِ محکم سے، علوم کی تحصیل سے، علم اشیاء کی جہانگیری سے، اور دنیوی قوتوں کی تسخیر سے۔

زندگی جہد اَست و اِستحقاق نیست
جز بہ علمِ انفس و آفاق نیست

اقبال نے اہل فلسطین کو خطاب کرتے ہوئے ''خودی کی پرورش'' اور لذتِ نمود کو اُمتوں کی ترقی اور آزادی وغلامی سے نجات کا ذریعہ قرار دیا:

سنا ہے مَیں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

آخر یہ لذت نمود کیا چیز ہے؟ مٹی کی تاریکیوں سے تخم باہر نکل کر بتدریج ایک تناور درخت بنتا ہے۔ یہی لذت نمود ہے، نازک کلی چٹکتی ہے اور رنگین و شگفتہ پھول کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی لذت نمود ہے۔ ایک طفل شیر خوار جو سہارے، مدد اور دیکھ بھال کا محتاج ہوتا ہے، ایک دن تندرست و توانا اور مرد قوی بن جاتا ہے۔ یہی لذت نمود ہے۔ ''خودی کی پرورش'' دراصل اپنی پوشیدہ اور خوابیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے، اُن کو درجۂ کمال تک پہنچانے اور فطرت کے منشاء کے مطابق ان سے کام لینے کا نام ہے۔ خاک کا ایک ذرۂ بے مقدار قدموں کے نیچے پامال ہوتا ہے، لیکن اگر اس کا جگر چیر کر اس کے جوہر خفتہ کو بیدار اور برسرکار کر دیا جائے تو اس سے طاقت کا وہ خزانہ دریافت ہوتا ہے جو زلزلہ افگن ہوتا ہے اور چٹانوں کو چور کر دیتا ہے۔ اقبال نے غلامی سے نجات کا اور شوکت وعزت کی بازیابی کا یہی راستہ بتایا ہے۔

اب ہم یہاں فلسطین کے حوالے سے اُردو کے کئی ایک دوسرے شعراء کے کلام کے اقتباسات پیش کریں گے۔ فلسطین کے جہاد اور جنگ آزادی پر فیض احمد فیض اس طرح سخن سرا ہوئے تھے:

ہم دیکھیں گے ، لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے ، جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم وستم کے کوہِ گراں، روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے، جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہل حکم کے سَر اوپر جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارض خدا کے کعبہ سے سب بت اُٹھوائے جائیں گے
ہم اہل صفا مزدور حرم مسند پر بٹھائے جائیں گے
سب تاج اُچھالے جائیں گے سب تخت گرائے جائیں گے

ایک اور شاعر محمد ایوب بسمل کی فلسطین پر ایک طویل نظم ہے، جس کا پہلا بند یہ ہے:

کفر ہے برسرپیکار یہاں برسوں سے
گرم ہے ظلم کا بازار یہاں برسوں سے
امن ہے نقش بہ دیوار یہاں برسوں سے
حق عدالت میں سرِ دار یہاں برسوں سے
دے گئی تحفۂ نایاب تجھے جنگ عظیم
کرگئی ارض مقدس کو بالآخر تقسیم

''اگلے کرسمس میں'' کے عنوان سے ف س اعجاز نے جو آزاد نظم کہی ہے، اس کا پہلا جز اس طرح ہے:

اس برس فلسطین کی سرزمین کے حق میں
سوگ میں شہیدوں کے
پیڑ سب کرسمس کے

سر سے پاؤں تک ننگے
چپکے چپکے روتے ہیں

معروف ومشہور شاعر رفعت سروش کی نظم ''اے ارضِ فلسطین'' کا آخری بند اس طرح ہے:

مظلوم بھی جاگ اٹھے ہیں یلغار کریں گے
دست حق وانصاف کے باطل سے لڑیں گے
کہہ دو یہ ممولوں سے کہ اب آتے ہیں شاہین
اے ارض فلسطین! اے ارض فلسطین!

عائشہ مسرور نے ''نئی لوری'' کے عنوان سے فلسطین کے پس منظر میں یہ غم ناک نظم کہی ہے۔ خیمہ کے اندر ایک ماں اپنے بچے کو لوری سنا رہی ہے۔

اے میرے نورعین! جاگ
اے میرے دل کے چین! جاگ
تیرا شفیق باپ تو جنگ میں کام آ گیا
تشنہ دہن کے ہاتھ میں موت کا جام آ گیا
دشت و دمن لہو لہو
سارا وطن لہو لہو
صحن چمن لہو لہو
قوم بچھڑ کے رہ گئی
ساکھ بگڑ کے رہ گئی
مانگ اُجڑ کے رہ گئی

فلسطین کے موضوع پر کوثر صدیقی نے نظم کہی ہے، نظم کے آخر میں اپنے شعری قلم سے یوں غم فشاں ہیں:

لا اِلہ کی تیغ سے ہی ہوسکا
مرد مومن اندلس میں کامراں
لا اِلہ کا تیشہ بھر کر آبدار
لا اِلہ سے توڑ ہر بُت کا گماں
لا اِلہ کی لے کے مشعل ساتھ چل
لوٹ لے ظلمت نہ رخت ِ کارواں
لا اِلہ کو چھوڑ کر ہے ناتواں
لا اِلہ کی ساتھ رکھ تیغ و سناں
لا اِلہ کی برق شعلہ بار سے
ختم اِسرائیل کا کر آشیاں

معروف ادیب اور شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف نعیم صدیقی نے ''یروشلم'' کے عنوان سے بہت طویل نظم کہی ہے جس کے دو تین شعر حسب ذیل ہیں:

یروشلم یروشلم تو ایک حریم محترم
تیرے ہی سنگ در پر آج منہ کے بل گرے ہیں ہم
تجھے دیا ہے ہاتھ سے بزخم دل بچشم نم
یروشلم یروشلم یروشلم یروشلم

اہل شعروادب قیصر الجعفری کے نام سے واقف ہیں، ان کی نظم ''حریفِ جاں سے کہو'' کے چند اشعار بطورِ نمونہ پیشِ خدمت ہیں:

زمین بوجھ اُٹھائے گی اور کتنے دن
تمام شہر ستم گروں کی زد پر ہے
ہزار بار چلاؤ ہزار بار مجھے
تمہاری شمع اَزل سے ہوا کی زد پر ہے
تمام تیر مشیت کی چٹکیوں میں ہیں
کہیں بھی جائے پرندہ قضا کی زد پر ہے
لہولہان شجر چیختے ہیں صدیوں سے
تمہاری تیشہ زنی بدذعا کی زد پر ہے
سمٹنے والا ہے یہ کاروبارِ تیرہ شبی
تمہاری رات چراغ حرا کی زد پر ہے
کھلیں گے مسجد اقصیٰ کے بند دروازے
تمہاری ساری خدائی ، خدا کی زد پر ہے

☆☆☆

❑ قضیۂ فلسطین

نظریۂ تقریبِ ادیان اور مسجد اقصیٰ

محمد فرید حبیب ندوی

تقریب ادیان دراصل وحدت ادیان ہی کا دوسرا نام ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی انفرادیت کو ختم کر کے اسے دوسرے مذاہب میں مدغم کر دیا جائے یا اسے ان کے ساتھ اس طرح ضم کر دیا جائے کہ اس کے اپنے اصول وعقائد اور امتیازات وخصائص دب کر رہ جائیں۔ یہ نظریہ رواداری اور پرامن بقائے باہم جیسے روشن القاب کا سہارا لے کر اُس حد تک پہنچا دیتا ہے، جہاں سے مداہنت فی الدین کی سرحد شروع ہوجاتی ہے، جسے اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے، اس نظریہ کا اصل الاصول یہ ہے کہ تمام مذاہب برابر ہیں، ایسا نہیں کہ کوئی ایک مذہب حق ہو اور باقی سب باطل، بلکہ سب ہی حق پر ہیں، راستے الگ الگ ہیں، مگر منزل سب کی ایک ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ سراسر باطل ہے۔ حق صرف ایک ہے اور وہ اسلام ہے، اس کے علاوہ تمام مذاہب یا تو منسوخ ہیں یا باطل۔

اس نظریہ کو اچھالنے والے عیسائی تھے، پھر انہوں نے اپنے ساتھ یہودیوں اور دیگر اہل مذاہب کو بھی ملا لیا۔ اس کے پیچھے ان کے بہت سے مقاصد تھے، جن میں ایک بنیادی مقصد اسلام کے بڑھتے سیلاب کو روکنا تھا، اس لئے کہ ایک بڑی تعداد روز بروز اسلام میں داخل ہو رہی تھی اور اس کے بڑھتے قدموں سے عیسائیت اپنے لئے خطرہ محسوس کرنے لگی تھی، چنانچہ اس نظریہ کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے جیسے دوسرے بہت سے مذاہب ہیں، اس کا کوئی امتیاز نہیں، جیسے وہ حق ہے، دیگر مذاہب بھی حق ہیں، اس لئے انہیں چھوڑ کر اسلام کی طرف جانا ایسا ہے جیسے ایک حق کو چھوڑ کر دوسرے حق کو قبول کرنا۔ اور افسوس کہ بہت سے لوگ اس دام فریب کا شکار ہو گئے، بلکہ خود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے اس فکر کو سپورٹ کیا۔ یہ ایک بہت بڑا فائدہ تھا، جو دیگر اہل مذاہب نے بالخصوص عیسائیوں نے حاصل کیا۔ اس کے علاوہ عیسائیوں نے اس نظریے کی مدد سے اور بھی بہت سے منافع حاصل کئے، جن کی تفصیل ہمارے اس موضوع سے باہر ہے، اس لئے ہم ان سے صرف نظر کر کے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ ''نظریہ تقریب ادیان اور مسجد اقصیٰ'' میں کیا ربط ہے اور نصرانیوں نے اس کی مدد سے مسجد اقصیٰ کے تعلق سے کونسا نفع حاصل کرنا چاہا ہے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ ہماری یہ گذارشات احمد بن عبدالرحمٰن بن عثمان قاضی (جامعہ

ام القریٰ) کے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''دعوۃ التقریب بین الادیان'' کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی ہیں، جس کے ایک اہم حصہ کا راقم ترجمہ کر رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ القدس پر صرف مسلمانوں کا حق ہے، مسجد اقصیٰ صرف مسلمانوں کی ہے، یہودیوں یا عیسائیوں کا اس پر اس وقت تک کوئی حق نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم پر صحیح طور پر عمل پیرا نہیں ہوجاتے، جس کی رو سے ان کا حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانا اور آپ کی اتباع کرنا ضروری ہے، ایک وقت تھا کہ مسجد اقصیٰ پر عیسائیوں کا قبضہ تھا، لیکن جب انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے انحراف کیا، تو اس پر ان کا کسی طرح کا کوئی حق نہیں رہا، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ کی بازیافت کی، اور حق اہل حق تک پہنچا، اس کے بعد کئی صدیوں تک القدس مسلمانوں کے زیر نگیں رہا، حتی کہ پھر دوبارہ اس پر عیسائیوں نے مجرمانہ تسلط کرلیا، تو اس وقت اللہ تعالی نے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی شکل میں ایک مرد مجاہد پیدا کیا، جس نے نوے سال کے غاصبانہ تسلط کے بعد ایک بار پھر حق اہل حق تک پہنچایا، سلطان مرحوم کی عیسائیوں سے بہت سی جنگیں ہوئیں، جو صلیبی جنگوں کے نام سے مشہور ہیں، اور سچ یہ ہے کہ ان جنگوں میں سلطان نے صلیب کے پجاریوں کو ایسا سبق سکھایا، جسے وہ کبھی فراموش نہ کرسکیں گے،، اور اس بری طرح انہیں شکست دی کہ اب ان کے لئے القدس پر قبضہ کرنا ناممکن ہوگیا، اور صدیوں تک وہ یہ خواب بھی نہ دیکھ سکے کہ مسجد اقصیٰ کبھی ان کے ہاتھوں میں بھی آئے گی۔لیکن جب سامراجی دور شروع ہوا، تو انہوں نے ایک منصوبہ بند پلاننگ کے ساتھ دنیا والوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ القدس پر عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں سب کا حق ہے، وہ صرف مسلمانوں کا نہیں، بلکہ تینوں مذاہب کا مشترکہ حق ہے، اور اس فکر کو عام کرنے کے لئے انہوں نے ''نظریۂ وحدت ادیان'' کا سہارا لیا۔

چنانچہ فکر تقریب کے حامل نصاری، پوپ سادس پولس کے عہد میں ہونے والی دوسری ویٹیکن کونسل سے لے کر اب تک اس طرح کے دعوے کرتے رہے ہیں کہ القدس پر ان کا بھی برابر کا حق ہے، حتی کہ ہزارۂ سوم کے پہلے کرسمس کے موقع پر انہوں نے دنیا کے کونے کونے سے بیت المقدس، ناصرہ اور بیت لحم کی طرف کوچ کرکے اس بات کا عملی نمونہ دکھانے کی کوشش کی کہ القدس ہمارا بھی ہے۔

۱۹۶۹ء میں رباط میں ''مؤتمر اسلامی برائے قائدین حکومات اسلامی'' کے عنوان سے ہونے والی کانفرنس میں پوپ سادس پولس نے کہا تھا: ''دنیا میں امن وامان اور اتحاد وہم آہنگی کا آغاز اس طرح ہوسکتا ہے کہ تمام مقدس مقامات بالخصوص القدس میں تینوں توحیدی مذاہب کی نمائندگی رہے''۔

محرم ۱۴۱۷ھ مطابق جون ۱۹۹۶ء میں تقریب کے مسلمان اور عیسائی داعیوں نے مل کر ایک کانفرنس منعقد کی، جس کا عنوان تھا کہ ''بیت المقدس کے لئے مسلمان اور عیسائی ساتھ ساتھ ہیں''، اس کانفرنس میں مسلم نمائندوں نے اپنے عیسائی احباب کو بیت المقدس میں شرکت کا حق بھی دے ڈالا۔

محمد مہدی شمس الدین نے ایک ایسی اسلامی مسیحی تنظیم

(امانۃ عامۃ) قائم کرنے کی پرزور دعوت دی، جو عالمی پیمانے پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان القدس کی حفاظت کو رواج دینے کی ذمہ داری اٹھائے۔

بھلا بتائیے وہ لوگ کیا القدس کی حفاظت کریں گے، جو سالوں سے قدس کی پاک زمین کو لالہ زار کئے ہوئے ہیں۔

کیتھولک بطریق میکسیموس خامس حکیم نے دھمکی بھرے انداز میں کہا: ''القدس کسی ایک حکومت یا مذہب کا کبھی نہیں ہوسکتا، لازماً وہ تینوں مذاہب کا ہے''۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ القدس صرف مسلمانوں کا ہے اور کوئی بھی مسلمان اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوسکتا کہ اس کے اِس حق میں کوئی برابری کا شریک ہو، خواہ وہ کوئی بھی ہو، لیکن ہائے بدبختی کہ بہت سے مسلمان دعوت تقریب کی وجہ سے اس سلسلے میں عیسائیوں اور یہودیوں کے ہم نوا ہوگئے اور یہ ماننے لگے کہ وہ سب کا مشترکہ حق ہے، اس طرح ان دونوں مذاہب کو عالمی پیمانہ پر القدس پر اپنا حق جتانے کا موقع ملا، ورنہ اس فکر سے پہلے مسلمانوں نے کبھی بھی ان کے لئے القدس پر کسی طرح کے حق کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ تقریب کی کانفرنسوں میں فلسطینی مسلمانوں پر ہورہے ظلم وستم اور مسجد اقصی کی پامالی و بے حرمتی کے تعلق سے کوئی چرچا نہیں ہوتی؛ بلکہ اس قضیہ سے ہمیشہ دامن بچانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالا جاتا جس سے ظالموں کے ظلم کی پردہ دری ہوتی ہو۔

آگے چل کر تقریب کے داعی نصاریٰ اور یہودیوں نے ایک نئی چال چلی، جب ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے قیام کا فیصلہ ہوا، اور اس طرح یہودیوں کا القدس پر ناجائز تسلط قائم ہوگیا تو عیسائیوں نے کھل کر ان کی حمایت کی، آج گرچہ القدس پر یہودیوں کا قبضہ ہے، لیکن عیسائی بھی اس میں برابر کے شریک اور ان کے مؤید و حامی ہیں، اس تائید کا سبب عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی واپسی سے قبل یہودیوں کی ایک حکومت کا قیام ضروری ہے، چنانچہ وہ موجودہ اسرائیلی یہودی حکومت کی مکمل تائید کرتے ہیں، تاکہ حضرت عیسی کی واپسی کی راہ آسان ہوسکے، بہرحال، ہمیں اس وقت ان تاریخی حقائق سے بحث نہیں، عرض صرف اتنا کرنا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی مشارکت وہم نوائی میں نظریۂ تقریب نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے، اور ایک طویل عرصے تک اس نظریہ نے ان کی فکری آبیاری ہے، لہذا ضرورت ہے کہ اس نظریہ کی سنگینی کا ادراک کیا جائے اور جو مسلمان تقریب کے نام پر القدس کے سلسلے میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ہم آواز بن گئے ہیں، وہ اپنی رائے پر دوبارہ غور کریں، اس لئے کہ تقریب ان دونوں مذاہب کی مجبوری ہے، اب ان کے پاس کوئی حقیقت باقی نہیں ہے، اس لئے وہ اس فکر کے ذریعے اپنے حق میں دوسروں سے بالخصوص مسلمانوں سے اعتراف کروانا چاہتے ہیں، مگر حیرت ہے بعض اہل اسلام کی سادہ لوحی پر کہ وہ کس طرح ان کی سازش کا شکار ہوگئے اور بہت سے مسائل میں بالخصوص مسجد اقصی کے بارے میں ان کی تائید وحمایت کرنے لگے۔

☆☆☆

❑ قضیۂ فلسطین

مسجد اقصیٰ سے متعلق چالیس حقائق
جن سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

مسجد اقصیٰ امت مسلمہ کی ملکیت ہے، اس پر کسی دوسری قوم کا مذہبی، قومی، سیاسی اور جغرافیائی کسی لحاظ سے کوئی حق نہیں ہے، مسجد اقصیٰ امت مسلمہ کی عزت وعظمت کی علامت ہے، ہمارے شاندار ماضی کی شناخت ہے، ہمارے مستقبل کی ضمانت ہے، اس کی فریادیں خون رلاتی ہیں، دل کو دہلاتی ہیں، مگر اے اقصیٰ ہم مجبور ہیں، ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ہیں، ہمارے مسلم حکمرانوں نے ہی تجھے انسانی دنیا میں بسنے والی بدترین مخلوق کے حوالے کیا ہے، ان عرب حکمرانوں کے ناعاقبت اندیش اقدامات کے سبب ہی فلسطین میں یہودی کالونی بنی، پھر اسرائیلی ریاست قائم ہوئی، پھر رفتہ رفتہ فلسطین اور اس کے مقدسات پر یہودی تسلط ہوگیا، فلسطینیوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جانے لگا اور مسجد اقصیٰ کے تقدس کو پیروں تلے روندا جانے لگا، عالمی برادری نے بھی عدل وانصاف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پورے فریب کا مظاہرہ کیا، اسپین پر تو عیسائیوں کے حق کی وکالت کی مگر فلسطین پر یہودیوں کے ظالمانہ و غاصبانہ قبضہ کے بالمقابل مسلمانوں کے آبائی، موروثی، مذہبی اور تاریخی حق کو قبول نہ کرتے ہوئے ہمیشہ یہودیوں کے مفادات کی بات کی، مسجد اقصیٰ کے متعلق بہت سارے مسلمان بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں، چنانچہ وہ اسی طرح بولتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں کہ کشمکش کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ جگہ عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے لیے یکساں طور پر مقدس ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد پر صرف مسلمانوں کا استحقاق ہے، اس کو اسلامی شناخت خود رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمائی، یہودیوں کا مذہب اور ان کی کتابیں رد کرتی ہیں جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔

مگر سلام ہے اس قوم کو جس کے بچے عرب کے فوجی جرنیلوں سے اچھے ہیں، جس کی عورتیں عرب کے مردوں سے بہتر ہیں، جس کے بوڑھے عرب کے نوجوانوں سے زیادہ جوان ہیں، جن کے دلوں میں مسجد اقصیٰ کی محبت پیوست ہے، جو نہتے ہیں مگر یہودی فوجی ان کے سامنے اپنے تمام تر خونخوار مظالم کے باوجود بے بس نظر آتے ہیں، سلام ہے ان جیالوں کو جو اپنے خون کا نذرانہ دے کر، اپنے عیش وآرام اور اپنی جانوں کو نچھاور کر کے مسجد اقصیٰ کی حفاظت کر رہے ہیں، کتنے بچے بغیر دوا اور غذا کے بلک بلک کر مرجاتے ہیں، کتنی عورتیں روز بیوگی کا درد سہتی ہیں، کتنے گھر مسجد اقصیٰ کے لئے قربان ہو چکے، مگر پھر بھی وہ ڈٹے ہوئے ہیں، سلام ہے ان کو جو صبح وشام اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔

یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کی محبت وعقیدت کو دلوں سے نکالنے کے لئے متعدد داؤ کھیلے، حقائق کو مسخ کیا، لوگوں تک غلط معلومات پہنچائیں، پروپیگنڈے کیے، مسجد اقصیٰ کے قضیہ کو

صرف عربوں یا صرف فلسطینیوں کا قضیہ بنا کر انسانیت اور اسلام سے اس کا رشتہ کاٹنے کی کوشش کی، لیکن الحمدللہ ہر محاذ پر کچھ اللہ کے بندے ان کا مقابلہ کرتے رہے، ایک طبقہ جان ومال اور خون سے اقصیٰ کے ذرے ذرے کا محافظ بنا ہوا ہے، تو ایک طبقہ نے اس قضیہ کو عالمی سطح پر زندہ کر رکھا ہے، صحیح معلومات ہم پہنچانے کی سعی پیہم کرتا رہتا ہے، ہمیں خوشی ہے کہ اقصیٰ کی خاطر ہم بھی یہ معمولی سی خدمت کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں، اللہ اس کو قبول فرمائے اور ہماری آنکھیں قبلہ اول کی بازیابی سے ٹھنڈی فرمائے، یقیناً یہ ہوگا، اللہ کی مدد آئے گی، جب یہ امت نصرت خداوندی کے نزول کے شرائط پورے کر دے گی، جب عرب کے صہیونیوں سے نجات مل جائے گی تو نصرت خداوندی آئے گی، متی نصر الله! ألا ان نصر الله قريب.

اے اقصی ہم تیری راہ میں کوئی اور قربانی دینے سے فی الحال قاصر ہیں مگر تجھ سے یہ وعدہ ہے اور مرتے دم تک ہم ان شاءاللہ یہ وعدہ وفا کریں گے کہ ہماری زبان اور ہمارا قلم تیری راہ میں تیغ براں ہے، ہمارا قلم یہود کو غاصب اور عرب حکمرانوں کو خائن لکھے گا، تجھ پر امت مسلمہ کا استحقاق ثابت کرے گا، ہماری زبان تیرے لیے رب کریم سے فریاد کرتی رہے گی، ہم تیری راہ میں وفا کی تاریخ رقم کرنے والوں سے یکجہتی کا اور اخلاقی ہمدردی کا اظہار کرتے رہیں گے، تو ہمارے دلوں کی دھڑکن بن کر زندہ رہے گی، ہماری آنکھوں کا نور بن کر روشن رہے گی، تیری تاریخ سے ہم اپنے بچوں کے ذہنوں کو منور کریں گے، تیرے قضیہ کو ہم ہر حال میں عالمی اور انسانی سطح پر زندہ رکھیں گے، تیرے ثابت شدہ اسلامی تقدس سے ہم ہر ہر شخص کو واقف کرائیں گے، ہم اپنے اس ملک میں رہتے ہوئے تمام جمہوری طریقوں کو تیری بازیابی کے لیے استعمال کریں گے، فلسطین اور مسجد اقصیٰ کے تئیں ہر مسلمان کا وہی موقف ہے جس کا جرأت مندانہ اظہار آخری با اختیار عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی عثمانی نے کیا تھا کہ ''میں فلسطین کا ایک انچ ٹکڑا بھی نہیں دے سکتا کیوں کہ یہ امت مسلمہ کی امانت ہے۔''

ہم اللہ کے حضور سجدہ شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہم کو اس خدمت کی توفیق بخشی کہ ہم اقصیٰ سے متعلق کچھ حقائق اور کچھ تعارف پیش کر سکے، خدایا تیرا صد ہزار شکر! مسجد اقصی کے متعلق بہت سارے پڑھے لکھے لوگ بھی بہت کچھ بلکہ بنیادی باتیں بھی نہیں جانتے، رفتہ رفتہ یہ اہم اسلامی قضیہ لوگوں کے دل ودماغ سے محو ہو رہا ہے، اس لیے ہم کو جب مجلّہ الوعی الاسلامی کا یہ مختصر مگر جامع تعارف نامہ ملا تو ہم نے دو دن میں اس کو اردو میں منتقل کیا، ہمارے بعض عزیز دوستوں نے کتابت ومراجعت کی، اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ اس کو خوب عام کریں، کوئی صاحب خیر اگر اس کو طبع کرا دے تو یہ اقصیٰ کے لئے اس کی قربانی ہوگی، اللہ تعالیٰ مجلّہ کے مدیر فیصل یوسف العلی اور اس تعارف نامہ کے مولف ڈاکٹر عیسیٰ القدومی کو جزائے خیر دے، جنھوں نے مفاد پرستی کے اس دور میں بھی مسجد اقصیٰ کے مشن کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے، اللہ تعالیٰ سب معاونین اور مسجد اقصیٰ کے مرابطین ومرابطات اور اس کی راہ میں تگ ودو کرنے والوں کو اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے اور امت مسلمہ کو اس مشن کے اختتام تک پہنچانے کی توفیق مرحمت فرمائے اور مسجد اقصیٰ کی بازیابی سے اس امت مرحوم کی عظمت رفتہ بحال فرمائے۔

۱۔ المسجد الاقصی: جب مسجد اقصی بولا جاتا ہے تو اس کا اطلاق پوری مسجد پر ہوتا ہے، وہ پورا قطعہ ارضی جس کے ارد گرد دیواریں ہیں، جس میں دروازے ہیں اور وسیع میدان

ہیں، جس میں المصلی الجامع ہے، قبۃ الصخرۃ ہے، المصلی الریوانی ہے، برآمدے ہیں، گنبد ہیں، چبوترے ہیں، پانی کی نالیاں ہیں اور دیگر معالم وآثار ہیں، مسجد اقصی کی دیواروں پر مئذن (اذان دینے کی جگہیں) بنی ہوئی ہیں، مسجد اقصی پوری کی پوری بغیر چھت کی ہے سوائے قبۃ الصخرۃ اور المصلی الجامع کے جس کو عام طور پر لوگ مسجد اقصی سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ جتنا حصہ باقی بچتا ہے وہ مسجد کے صحن کے حکم میں ہے، یہ پورا خطہ جو دیواروں سے گھرا ہوا ہے مسجد اقصی کے حکم میں ہے، اسی پر علماء ومؤرخین کا اتفاق ہے، مسجد اقصی میں نماز پر کثرت سے ثواب کی جو بشارت ہے وہ ان دیواروں کے اندر کے خطہ کے کسی بھی گوشہ میں نماز ادا کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔

۲۔ **مسجد اقصی** کے متعدد نام ہیں، جن کی کثرت ہی اس کی علو شان پر دلالت کرتی ہے، مسجد اقصی اور بیت المقدس کے لئے تقریباً بیس نام جمع کئے گئے ہیں، جن میں سب سے مشہور وہ ہیں جو کتاب وسنت میں وارد ہیں، یعنی المسجد الاقصی، بیت المقدس، ایلیاء، اس کا اقصی نام ذکر کرنے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے، کہ اس کو اقصی شاید اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ان مساجد میں سب سے دور دراز واقع ہے جن کی زیارت اجر وثواب کی نیت سے کی جاتی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کو اقصی اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے پیچھے عبادت کی کوئی جگہ نہیں ہے، اس کو اقصی گندگیوں اور خباثتوں سے دور رہنے کی بنا پر بھی کہا گیا ہے۔

۳۔ **مسجد اقصی**: شہر پناہ سے گھرا شہر بیت المقدس چار ٹیلوں پر واقع ہے، انہی میں سے ایک ٹیلے پر مسجد اقصی واقع ہے، مسجد اقصی پوری دنیا میں واحد ایک ایسی مسجد ہے جس کے ساتھ دیگر تفصیلات بھی جڑی ہوئی ہیں، چنانچہ مسجد اقصی میں متعدد عمارتیں ہیں، گنبد، پانی کی نالیاں، چبوترے، برآمدے، مدارس، پانی کے حوض، درخت، محرابیں، مسند ومنبر، متعدد مئذن، دروازے کنویں، کتب خانے، ائمہ کے حجرے، مسجد اقصی کی نگرانی کرنے والوں کے کمرے سب اس میں شامل ہیں، چنانچہ اس کا کل رقبہ 40104 مربع میٹر ہے۔

۴۔ **مسجد اقصی** روئے زمین پر اپنے وجود کے اعتبار سے حرم شریف کے بعد دوسری مسجد ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر کی گئی، فرمایا مسجد حرام، میں نے پوچھا پھر کون سی، فرمایا: مسجد اقصی، میں نے پوچھا دونوں کی تعمیر کے درمیان کتنی مدت فاصل ہے، فرمایا: چالیس سال، تم کو ان تینوں کے بعد جہاں بھی نماز کا موقع ملے وہاں نماز پڑھ لو کہ اسی میں فضیلت ہے۔ (بخاری)

۵۔ **مسجد اقصی** اور اس کے اردگرد برکتیں رکھ دی گئی ہیں، مسجد اقصی ایسی جگہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے باعث برکت بنایا ہے، اس کا ارشاد ہے (سبحان الذی اسری بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حوله لنریه من آیاتنا انه هو السمیع البصیر) (الاسراء:۱) (بڑی مقدس ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصی لے گئی، جس کے اردگرد (کے ماحول) کو ہم نے برکتوں سے معمور کر رکھا ہے، مقصد یہ تھا کہ ان کو ہم اپنی نشانیاں دکھا دیں، بے شک اللہ خوب سننے اور دیکھنے والا ہے۔)

اس مسجد کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر اس آیت کے علاوہ اس کو اور کوئی فضیلت حاصل نہ ہوتی تو صرف یہ آیت اس کے فضائل اور تمام برکتوں کے لیے کافی ہوتی، اس لیے کہ جب اس کے اردگرد برکتیں رکھ دی گئی ہیں تو پھر اس کے اندر کئی گنا زیادہ برکتیں رکھی گئی ہیں، اس کی برکت کا اندازہ اس سے کیجئے

کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی کے علاوہ تمام مساجد پر فضیلت بخشی گئی ہے۔

۶۔ **مسجد اقصی** مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے، امام بخاری نے حضرات براء بن عازبؓ کی سند سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ۱۶ مہینے نماز ادا کی یا ۱۷ مہینے ادا کی، پھر ہم کو تحویل قبلہ کا حکم ہوا، لیکن تحویل قبلہ نے اس کے مقام و مرتبہ کو ختم نہیں کیا، بلکہ اس کی عظیم قدر و قیمت مسلمانوں کے دلوں میں اور شریعت اسلامی میں باقی رہی۔

۷۔ **مسجد اقصی** کے فضائل نبی کریم ﷺ نے بیان فرماتے ہیں، اس کی قدر و قیمت اور اس سے مسلمانوں کے قلبی تعلق کے سلسلے میں یہاں تک بیان فرمایا ہے کہ ایک مسلمان یہ تمنا کرے گا کہ اس کے لیے کوئی ایسی چھوٹی سی جگہ ہو جس سے وہ مسجد اقصی کو جھانک سکے یا وہاں سے وہ اسے دیکھ سکے، اور یہ چیز اس کے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہوگی۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ کے پاس تھے، ہم آپس میں مذاکرہ کرنے لگے کہ مسجد نبوی زیادہ افضل ہے یا بیت المقدس، تو رسول اللہ ؟ نے فرمایا کہ میری مسجد میں ایک نماز بیت المقدس میں چار نمازیں پڑھنے سے افضل ہے، جبکہ وہ نماز پڑھنے کی بہترین جگہ ہے، آدمی یہ تمنا کرے گا کہ اس کے پاس گھوڑے کو زمین سے باندھنے والی رسی کے برابر کوئی جگہ ہو جہاں سے وہ بیت المقدس کو دیکھ سکے، یہ اس کے لیے پوری دنیا مل جانے سے بہتر ہوگا، ابوذرؓ کہتے ہیں یا یہ کہا کہ یہ اس کے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔

۸۔ **مسجد اقصی** کی فتح سے قبل ہی نبی کریم ﷺ نے اس کی فتح کی بشارت دی، آپؐ کی یہ بشارت علامات نبوت میں سے ہے، عوف بن مالک فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس غزوۂ تبوک میں آیا اور آپؐ چمڑے کے خیمے میں تھے تو آپؐ نے فرمایا قیامت کی چھ نشانیاں شمار کرو (ان کو ذکر کرنے کے بعد) آپؐ نے ان ہی میں فتح بیت المقدس کا ذکر کیا۔ (بخاری)

۹۔ **مسجد اقصی** میں اس جماعت کا ٹھکانہ ہے جس کی مدد اللہ کرے گا، وہ مؤمنین کے گھر کا مرکزی حصہ ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے گا جو حق لیے برسر پیکار رہے گا، وہ ان لوگوں پر غالب آئے گا جن سے ہماری دشمنی ہوگی، یہاں تک کہ اس گروہ کا آخری فرد مسیح دجال سے جنگ کرے گا۔ (احمد، ابو داؤد، حاکم، طبرانی نے اس کو نقل کیا ہے اور البانی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے) یہ بات معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰؑ دجال کو فسلطین میں باب لدّ کے پاس پکڑیں گے اور قتل کریں گے۔

۱۰۔ **مسجد اقصی**، بیت المقدس اور بلاد شام کی زمین وہ سر زمین ہوگی جہاں حشر و نشر قائم ہوگا، تمام بندوں کو جمع کیا جائے گا، نبی اکرمؐ آزاد کردہ باندی میمونہ بنت سعد فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے کہا کہ ہم کو بیت المقدس کے بارے میں بتائیے آپؐ نے فرمایا کہ وہ حشر و نشر کی زمین ہے۔ (رواہ ابن ماجہ، البانی نے اس کو صحیح شمار کیا ہے)

۱۱۔ **مسجد اقصی** ہی وہ مقام ہے جس میں مومنین دجال سے بچ کر پناہ لیں گے اور وہ اس میں نہ داخل ہو سکے گا، نبی پاکؐ نے دجال کے متعلق فرمایا: ''اس کی علامت یہ ہے کہ وہ روئے زمین پر ۴۰ دن ٹھہرے گا، اس کی حکومت ہر جگہ قائم ہو جائے گی سوائے چار مساجد کے، کعبہ مقدسہ، مسجد نبوی، مسجد اقصی اور طور''۔

۱۲۔ **مسجد اقصی** ہی وہ مقام ہے جہاں واقعہ اسراء میں نبی کریمؐ کو دنیا کی پہلی مسجد سے دنیا کی دوسری مسجد تک لایا گیا،

چنانچہ دونوں مساجد کا فضل وشرف آپ قبلوں کو عطا کیا گیا، اور دونوں قبلوں کی زیارت اوران کی فضیلت آپ کو دی گئی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس براق لایا گیا، وہ سفید رنگ کا جانور تھا، گدھے سے بڑا تھا اور خچر سے چھوٹا، وہ اپنے قدم اپنی حد نگاہ پر رکھتا تھا، فرماتے ہیں کہ میں سوار ہوا یہاں تک کہ بیت المقدس آیا، پھر میں نے اس کو اس حلقہ میں باند دیا جس میں انبیاء (اپنی سواریاں) باندھا کرتے تھے، فرماتے ہیں کہ پھر میں مسجد میں داخل ہوا میں نے اس میں دو رکعت نماز ادا کی پھر میں نکلا، پھر میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے ایک پیالے میں شراب اور ایک پیالے میں دودھ لے کر، تو میں نے دودھ لیا، تو جبریلؑ نے کہا کہ آپؐ نے فطرت کو پسند کیا، پھر ہمیں لے کر آسمان پر لے جایا گیا۔۔۔۔۔(مسلم)

۱۳۔ **مسجد اقصی** روئے زمین پر وہ واحد جگہ ہے جہاں تاریخ انسانی کا سب سے عظیم اجتماع ہوا، جس میں کہ حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک خدا کے بھیجے ہوئے تمام انبیاء ورسول جمع ہوئے، اور پھر وہیں نبی کریمؐ نے لیلۃ الاسراء میں تمام انبیاء کی امامت فرمائی، یہ مسجد اقصی کی اسلامیت کا اعتراف ہے، مسجد اقصی پر امت محمدیہ کی امامت کا ثبوت ہے، وہاں آپؐ کی امامت تمام انبیاء کے مقدسات پر رسول اللہؐ کی وراثت ثابت ہونے کا اعلان ہے اوراس کا بھی اعلان ہے کہ آپؐ کی رسالت ان تمام مقدسات پر مشتمل وحاوی ہے اوران سب کا آپؐ کی رسالت سے ربط وتعلق ہے اور دین اسلام سابقہ آسمانی مذاہب کا وارث ہے۔

۱۴۔ **مسجد اقصی** وہ مسجد ہے جس کی طرف ثواب کی نیت سے سفر کیا جاتا ہے، مسجد اقصی کی زیارت اوراس میں نماز ادا کرنے کے مستحب ہونے پر اہل علم کا اجماع ہے، بالقصد جن تین مساجد کی طرف سفر کیا جاسکتا ہے ان میں سے ایک مسجد اقصی ہے، ان تینوں مساجد کو دنیا کی دیگر مساجد پر فضیلت حاصل ہے، صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بالقصد زیارت کے لیے سفر نہیں کیا جائے گا مگر صرف تین مساجد کی طرف وہ مسجد حرام، مسجد اقصی اور میری مسجد ہیں'' یہی وجہ ہے کہ بہت سے صحابہ نے مسجد اقصی میں نماز پڑھنے کے لئے خاص طور پر سفر کیا، بعد کے ادوار میں ہمارے اسلاف نے مسجد اقصی کو اپنے علمی حلقوں سے رونق بخشی۔

۱۵۔ **مسجد اقصی** میں نماز کا ثواب بڑھا دیا جاتا ہے۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ کے پاس تھے، ہم آپس میں مذاکرہ کرنے لگے کہ مسجد نبوی زیادہ افضل ہے یا بیت المقدس، تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میری مسجد میں ایک نماز بیت المقدس میں چار نمازیں پڑھنے سے افضل ہے، جبکہ وہ بھی نماز پڑھنے کی بہترین جگہ ہے، آدمی یہ تمنا کرے گا کہ اس کے پاس گھوڑے کو زمین سے باندھنے والی رسی کے برابر کوئی جگہ ہو (جس پر چڑھ کر) وہ بیت المقدس کو دیکھ سکے، یہ اس کے لیے پوری دنیا مل جانے سے بہتر ہوگا، ابو ذرؓ کہتے ہیں یا یہ کہا کہ یہ اس کے لیے دنیا ومافیہا سے بہتر ہوگا۔

حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ مسجد اقصی میں ایک نماز کا ثواب دیگر مساجد میں ۲۵۰ نمازیں پڑھنے کے برابر ہے سوائے مسجد حرام اور مسجد نبوی کے۔

۱۶۔ **مسجد اقصی** میں نماز بڑے شرف کی بات ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے، تو اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کا سوال کیا، ایسی حکومت مانگی کہ پھر ان کے بعد ویسی حکومت کوئی نہ پائے، ایسا ملک مانگا کہ پھر ان کے بعد کسی کو نہ

ملے۔اور یہ کہ جو اس مسجد میں صرف نماز ادا کرنے کی نیت سے آئے تو اس طرح سے گناہوں سے پاک صاف ہوکر نکلے جیسے اسی دن اس کو اس کی ماں نے جنا ہو، حضورؐ فرماتے ہیں: ''دو چیزیں تو ان کو عطا کر دی گئیں، مجھے امید ہے کہ ان کی تیسری دعا بھی قبول کی گئی''۔(نسائی وابن ماجہ)

۱۷۔ **مسجد اقصی**، القدس اور فلسطین کو زمانۂ قدیم سے ہی تقدس حاصل رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: یٰقوم ادخلوا الارض المقدسة (مائدہ:۱۲)(اے میری قوم کے لوگو! اس مقدس شہر میں داخل ہو)۔

اس آیت میں جو خطاب ہے وہ حضرت موسیٰؑ کا اپنی قوم کو خطاب ہے، بنی اسرائیل کے فلسطین میں داخل ہونے سے پہلے اور ان انبیاء بنی اسرائیل سے قبل بھی اس کو تقدس حاصل تھا جن کی وراثت کا یہودی دعوی کرتے ہیں، حضرت ابراہیم ولوط علیہما السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ونجینٰه ولوطا الی الارض التی بٰرکنا فیها للعالمین (انبیاء)

برکت تو اس قطعہ ارضی میں حضرت ابراہیم سے بھی پہلے رکھ دی گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ یبوسی لوگ اس کے پاس تو رہا کرتے تھے، البتہ خود اس جگہ کبھی نہیں رہے، اس کو جائے سکونت کبھی نہ بنایا، اس لئے کہ وہ مقام عبادت تھا۔

۱۸۔ **مسجد اقصی** تاریخ کے تمام ادوار میں اسلامی مسجد اور مسلمانوں کی ملکیت رہی حتی کہ وہاں یہودیوں کی آبادی سے قبل اور ان کے آنے کے بعد وہ مسلمانوں کے ہی ملک میں رہی، فلسطین انبیاء کی سرزمین ان میں ابراہیمؑ، یعقوبؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، زکریاؑ اور یحییٰؑ ہیں، یہ سب کے سب مسلمان تھے، ہم ان کے درمیان تفریق نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ومن یرغب عن ملة ابراهیم الا من سفه نفسه ولقد اصطفیناه فی الدنیا وانه فی الآخرة لمن الصالحین ، اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العالمین ، ووصی بها ابراهیم بنیه ویعقوب یا بنی ان الله اصطفی لکم الدین فلا تموتن الا وانتم مسلمون (البقرہ:۱۳۰-۱۳۲)(ابراہیم کی ملت اور ان کے طور طریق سے اعراض کرنے والا وہی ہوسکتا ہے، جو اپنے تئیں احمق وسفیہ ہو، ہم نے دنیا میں ان کا انتخاب کیا، اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں ہوں گے جنھوں نے بالکل درست روش اختیار کی۔ یاد کیجئے اس وقت کو جب ان کے رب نے ان سے کہا تھا کہ اے ابراہیم! اپنے کو اللہ کے حوالے کر دو، تو انھوں نے عرض کیا: میں اپنی ذات کو رب العالمین کے حوالے کرتا ہوں، ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو اسی کی وصیت کی تھی، اے میرے فرزندو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اس دین (اسلام) کا انتخاب کیا ہے، لہذا اسلام پر ہی مرنا)

۱۹۔ **مسجد اقصی** میں بہت سے صحابہ کرام تشریف لے گئے ہیں، اس کی زیارت کے لئے سفر کیا ہے، وہاں رہنے، عبادت کرنے، وعظ وارشاد کے لیے تشریف لے گئے ہیں، شام کو فتح کرنے والی فوجوں کے سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ ان ہی صحابہ میں ہیں، بلال بن رباح فتح بیت المقدس کے موقع پر حضرت عمر بن خطابؓ کے ساتھ تشریف لے گئے اور مسجد اقصی میں اذان دی، حضرت معاذ بن جبلؓ کو ابوعبیدہؓ نے اپنے انتقال کے بعد وہاں کا والی بنایا، اللہ کی تیغ براں حضرت سیف اللہ بیت المقدس کی فتح میں شریک ہے عبادہ بن السامتؓ نے وہاں قیام کیا، فلسطین میں عہدۂ قضاء کی ذمہ داری سنبھالنے والے وہ پہلے شخص ہیں، وہ وہیں دفن بھی ہوئے، تمیم بن اوس الداریؓ اور عبداللہ بن سلامؓ بیت المقدس آئے اور فتح بیت المقدس میں شرکت کی اور آخر الذکر تو ان میں سے ہیں جن کو جنت کی کوشخبری دی گئی تھی، ان کے علاوہ بڑی تعداد ہے ان

صحابہ کرامؓ کی جنہوں نے مسجد اقصی کے لیے سفر اختیار کیا۔

۲۰۔ مسجد اقصی اور بیت المقدس جس شہر میں واقع ہے، وہ واحد شہر ہے جس کی کنجیاں لینے کے لیے خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ نے سفر کیا، اور ۱۵ھ میں مسجد اقصی کے صحن میں مصلی تعمیر کیا، جبکہ اللہ نے مسلمانوں کو فتح بیت المقدس سے سرشار کیا تھا، مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عمرؓ نے قبلہ کی طرف سے مسجد اقصی کی دیوار کے بالمقابل لکڑی کے ضخیم تختوں سے مسجد تعمیر کی، اس کو بہت سادہ تعمیر کیا گیا تھا، یہ عمارت چوکور تھی اور اتنی وسیع تھی کہ اس میں ایک ساتھ 3000 آدمی آسکتے تھے، جگہ کی تحدید خود حضرت عمرؓ نے اس طرح فرمائی تھی کہ وہ مسجد اقصی کے صحن میں بالکل درمیان میں رہے۔

۲۱۔ مسجد اقصی علمی حلقوں، اور مدرسین کی کثرت اور بڑی تعداد میں طلبہ کی آمد کی وجہ سے مشہور ہوئی، مدرسین نے الگ الگ چبوترے منتخب کر لیے جو کہ طلبہ کے بیٹھ کر درس سننے کے لیے تیار کئے گئے تھے، موسم گرما میں وہاں موسم معتدل ہونے کی وجہ سے یہ حلقے خاص طور پر لگتے تھے، مسجد اقصی کے پورے میدان میں تقریباً اس طرح کے تیس چبوترے ہیں، ان چبوتروں پر پتھر کی محرابیں بنائی گئی تھیں تاکہ تلامذہ کے سامنے شیخ بیٹھ سکے، ان میں سب سے زیادہ شہرت مصطبہ شرقی بصیری کو ملی جو باب النظر پر واقع ہے، یہ تدریس کے لیے استعمال ہوتا تھا، مسجد اقصی کے صحن کو جمالی رنگ دینے کے لیے ان میں سے بعض کی تعمیر عہد مملوکیہ میں ہوئی اور اکثر عہد عثمانی میں تعمیر کئے گئے۔

۲۲۔ مسجد اقصی کو حرم کے نام سے موسوم کرنا درست نہیں، اس لیے کہ حرم وہ ہے جہاں کا درخت کاٹنا اور شکار کرنا حرام ہو، اس کے اپنے خاص احکام ہیں، جب کہ بیت المقدس کے ساتھ ایسا نہیں ہے، وہاں درخت کاٹنا شکار کرنا حرام نہیں ہے جیسا کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں حرام ہے، یہ علماء کا متفقہ فیصلہ ہے، کتاب وسنت میں اس کے چار ثابت شدہ اسماء ہیں مسجد اقصی، بیت المقدس اور مسجد ایلیاء مسجد اقصی کے فضائل مسلم ہیں، البتہ ہم اس کے ناموں میں کسی ایسے نام کا اضافہ نہیں کر سکتے جس کو اللہ نے مشروع نہیں کیا۔

۲۳۔ مسجد اقصی کے متعلق جو غلط فہمیاں عام ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ وہ صخرہ یعنی وہ چٹان جس پر سنہرے گنبد والی عمارت تعمیر ہے جس کو قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے، اس کو کوئی خاص تقدس حاصل ہے، مسلم علماء اس کو خطا شمار کرتے ہیں اور اس کی نکیر کرتے ہیں، علماء کے مطابق یہ مسجد اقصی کی چٹانوں میں سے ایک چٹان ہے، اور مسجد اقصی کا جزء ہے، اس کے علاوہ اس کی کوئی دوسری خاص خصوصیت نہیں، اس کے سلسلے میں علیحدہ جو چیزیں ذکر کی جاتی ہیں شرعی اعتبار سے ان کی کوئی قیمت نہیں، جس کو شریعت نے کوئی تقدیس نہ دی ہو اس کی تقدیس کرنا صحیح نہیں، اس صخرہ کی فضیلت میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں، جو روایتیں اس کے سلسلہ میں بیان کی جاتی ہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف ان کی نسبت بالکل درست نہیں۔

۲۴۔ مسجد اقصی کا جزء حائط البراق ہے جس سے اس کو کسی طور پر بھی الگ نہیں کیا جا سکتا، وہ مسجد اقصی کی دیوار کا جنوب مغربی حصہ ہے، اس کا اسلامی املاک میں شمار ہے، اس وقت یہودی اس کو دیوار گریہ کہتے ہیں، ان کے دعوے کے مطابق وہ ہیکل کا باقی ماندہ حصہ ہے، یہود نے شہر قدس میں اپنے وجود سے پہلے کبھی اس طرح کا دیوار براق کے سلسلہ میں کوئی ایسا دعوی نہیں کیا، جب وہ قدس کی زیارت کرتے تھے تو مشرقی دیواروں کے پاس عبادت کرتے تھے پھر انہوں نے مسجد اقصی کی مغربی دیواروں کے پاس عبادت شروع کر دی، جب حائط البراق کی ملکیت کو لے کر مسلمانوں اور یہود کے درمیان نزاع

ہوا تو ۱۹۳۰ء میں یونائیٹڈ نیشن کی مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ مغربی دیوار صرف اور صرف مسلمانوں کی ملکیت ہے، وہ مسجد اقصیٰ کا ایسا جزء ہے جس کو اقصیٰ کے صحن سے الگ نہیں کیا جاسکتا، اور وہ اوقاف اسلامی کی املاک میں ہے۔

۲۵۔ مسجد اقصیٰ، اس سرزمین پر مختلف حکومتیں قائم ہوئیں لیکن اسلامی حکومتوں کے زمانے میں یہاں جتنا امن وسکون اور انصاف کا دور دورہ رہا اتنا کسی زمانے میں نہیں رہا، اس پر تمام علمائے تاریخ کی صریح شہادت موجود ہے، یہ بات اس سے اور مستحکم ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کے سایے میں شہر قدس کے کلیسا اور ذمیوں کی آزادی محفوظ رہی، اور آج تک اس رواداری کی مثال موجود ہے، ارض بیت المقدس پر حکمرانی کرنے والوں میں عہد اسلامی جیسی نرمی وعدل پروری کا مشاہدہ کسی دور میں نہیں کیا گیا۔

۲۶۔ مسجد اقصیٰ پر صلیبیوں نے ۲۳ شعبان ۴۹۲ھ جمعہ کے دن قبضہ کیا اور تقریباً ستر ہزار مسلمانوں کو قتل کیا، ان شہداء میں ایک بڑی تعداد ان طلبہ وعلماء اور عبادت گذاروں کی تھی جنہوں نے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر مسجد اقصیٰ کو اپنا مسکن بنایا تھا، بیت المقدس پر اکیانوے سال صلیبیوں کا تسلط باقی رہا، اس اثناء میں انھوں نے اس کی عزت پامال کی، مسجد کے متعدد آثار کو بدل ڈالا، اس کے ایک جانب کلیسا تعمیر کر دیا، اور ایک طرف اصطبل اور اپنے خزانے رکھنے کی جگہ تعمیر کر دی، مسجد کو انھوں نے سور اور جانوروں کے باڑے میں تبدیل کر دیا، جبکہ قبۃ الصخرۃ پر انھوں نے بڑی صلیب نصب کر دی۔

۲۷۔ مسجد اقصیٰ کو جب سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے صلیبی قبضہ سے آزاد کرایا تو مسجد کی اصلاح کا حکم جاری کیا اور صلیبی قبضہ سے قبل کی اس کی حالت پر اس کو واپس لانے کا حکم دیا، حلب سے وہ خوبصورت منبر لایا گیا جو سلطان نورالدین محمود بن زنگیؒ نے مسجد اقصیٰ کے لیے تقریباً ۲۰ سال قبل بنوایا تھا۔ اس منبر کو جمعہ کے دن خطیب کے کھڑے ہونے کے لیے مسجد میں نصب کیا گیا، یہ باقی رہا حتی کہ یہودیوں نے ۲۱/اگست ۱۹۶۹ء کو جب المصلی الجامع میں آگ زنی کی تو اس منبر کو بھی جلا دیا۔

۲۸۔ مسجد اقصیٰ، بیت المقدس اور ارض اسراء تاریخ کے کچھ حصے کو چھوڑ کر ہمیشہ اسلام کی سرزمین رہی، صرف تاریخ کے ان ادوار میں جبکہ اس پر قتل وغارت گری اور خون بہانے والوں کا قبضہ رہا وہ اسلامی حکومت کے ماتحت نہیں رہی، یہ وہی مجرمین ہیں جن کو قرآن نے ''قوماً جبّارین'' یعنی جالوت اور اس کے لشکر سے تعبیر کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ شرف بخشا کہ انھوں نے جالوت کو قتل کیا اور پھر اللہ نے انھیں حکومت عطا فرمائی، ان ہی جبارین میں رومی تھے اور یورپ کے صلیبی تھے اور آج کے عہد میں یہودیوں کا شمار ان ہی جبارین میں ہے۔

۲۹۔ مسجد اقصیٰ کی بازیابی اللہ تعالیٰ نے تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مقدر کر دی تھی، جن مسلمانوں نے اس کو آزاد کرایا ان میں حضرت موسیٰؑ کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں چلنے والے لوگ تھے جن کو کہ حضرت یوشع نے وادی تیہ سے نکالا تھا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں واذ قلنا ادخلوا هذه القرية فكلوا منها حيث شئتم رغدا وادخلوا الباب سجدا وقولوا حطة نغفر لكم خطاياكم وسنزيد المحسنين (البقرہ:۵۸) (اس وقت کا بھی خیال کرو جب ہم نے کہا تھا کہ اس شہر میں داخل ہو جاؤ، اور جہاں چاہو بفراغت کھاؤ پیو، (شہر کے) دروازے میں جھکتے ہوئے (تواضع کے ساتھ) داخل ہونا، اور استغفر اللہ کہتے رہنا، ہم تمہاری غلطیاں معاف

کر دیں گے، اور بہتر کام کرنے والے کو مزید (نعمتوں سے) نوازیں گے۔)

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ آیت میں القریہ سے مراد بیت المقدس ہے اور جہاد کرنے والے یہ لوگ وہ مسلمان ہیں جو حضرت داؤدؑ کے ساتھ جالوت کو قتل کرنے شرکت کی اور جو طالوت کے ساتھ جالوت اور اس کے لشکر سے جنگ کرنے شریک رہے تھے، ارشاد ربانی ہے فھزموھم باذن اللہ (بقرہ:۲۵۱) (آخرانھوں نے ان کو بحکم الٰہی شکست دی)۔

پھر حضرت داؤدؑ کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ آئے، ارشاد ہے وورث سلیمان داؤد (النمل ۱۶) (اور سلیمانؑ داؤدؑ کے وارث ہوئے) ان کے زمانے میں بیت المقدس مملکت اسلامیہ کا دارالسلطنت رہا نہ کہ یہودیوں کا پایۂ تخت جیسا کہ وہ دعوی کرتے ہیں۔

پھر اللہ کی روئے زمین کی آزادی کے معرکوں کی ابتدا خود رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کے ہاتھوں ہوئی ان ہی میں بیت المقدس کی آزادی کا معرکہ شامل ہے، یہ مشیت الٰہی تھی کہ مسجد اقصی عہد فاروقی میں ۱۵ھ میں آزاد ہو کر مملکت اسلامیہ کا حصہ بنی، اس سے قبل تقریباً سات صدیوں تک رومیوں نے اس پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا، عہد فاروقی کے بعد خیر و عافیت کے ساتھ حکومت اسلامیہ کے زیر نگیں رہی تھی کہ پانچویں صدی ہجری کے اخیر میں یورپ نے اس پر پھر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔

پھر اس کے بعد سلطان نورالدین زنگیؒ، سلطان صلاح ایوبیؒ اور ان کے دیگر حضرات کا دور آیا جنھوں نے مجاہدین کے دستوں کی دل جگری، بصیرت و پامردی کے ساتھ قیادت کی، یہاں تک ۹۱ سال کے غاصبانہ قبضہ کے بعد اس کو دوبارہ آزاد کرایا گیا، اس طرح بیت المقدس اور فلسطین پھر مملکت اسلامیہ کے زیر نگیں آیا اور مسلسل اسلامی سلطنت کا حصہ رہا، یہاں تک کہ مسلمانوں میں ضعف پیدا ہوا اور ان کو "وہن" کا مرض لاحق ہو یعنی ان میں موت سے خوف اور دنیا کی حرص آگئی تو پھر یہودیوں نے اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔

۳۰۔ **مسجد اقصی** پر یہودیوں نے ۱۳۸۷ھ، ۱۹۶۷ء میں غاصبانہ قبضہ کیا، اپنے تسلط کے بعد یہود نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہ "حائط البراق" پر قابض ہو گئے اور "حارۃ المغاربہ" یعنی مغاربہ محلّہ کو تہس نہس کر دیا، اس کے بعد انھوں نے چار مسجدیں، مدرسہ افضلیہ اور دیگر اوقاف اسلامیہ کو منہدم کر دیا، اس طرح یہودی سیلاب نے ایک اسلامی اوقاف میں شامل محلّہ کی تاریخ کو زمین دوز کر دیا۔

۳۱۔ **مسجد اقصی** کو منہدم کرنے کے لیے اور اس کی منہدم دیواروں پر اپنا مزعوم معبد (ہیکل) تعمیر کرنے کے لیے یہود نے زبردست تیاریاں کی ہیں، مسجد کو ڈھا کر ہیکل کی تعمیر کی کوشش کرنے والی تمام جماعتیں اس نقطہ پر متفق ہیں اور اس کے لیے متحدہ کوششیں کرتی ہیں اور اپنی تمام تر قوتوں کا اجتماعی استعمال کرتی ہیں، یہ تنظیمیں مختلف انداز سے ایسی سرگرمیاں جاری رکھتی ہیں جن سے "ہیکل کی تعمیر" فلسطین کے اندر اور فلسطین کے باہر بسنے والے ہر یہودی کے گھر کا مسئلہ بن جائے، غاصب یہودی حکومت ان تنظیموں کے ساتھ نرمی برتتی ہے، ان کا تعاون کرتی ہے اور اس حد تک کرتی ہے کہ ان کے بہت سے حملوں اور کارروائیوں کو گرین سگنل دیتی ہے۔

۳۲۔ **مسجد اقصی** کو یہودی رنگ دینے کے لیے یہود نے مختلف انداز سے اپنی سرکشی جاری رکھی ہے، مثلاً انہوں نے مسجد اقصی کے ارد گرد کے بہت سے راستوں، سڑکوں اور میدانوں کے نام تبدیل کر کے یہودی نام رکھ دیا، جس خطہ پر مسجد اقصی واقع ہے اس کا نام "جبل ہیکل" رکھ دیا تاکہ ان کے لیے اس کے صحیح اور حقیقی نام جبل بیت المقدس یا جبل المسجد

الاقصی سے گریز کرنا آسان ہو، یہ کام انھوں نے اس خطہ مبارکہ کو تورات کی قدیم اصطلاحات سے مربوط کرنے کے لیے کیا ہے، اور اس دعوی کو ثابت کرنے کے لیے کیا ہے کہ اس خطہ کا قدیم یہودی تاریخ سے رشتہ ہے۔

۳۳۔ مسجد اقصی کے بارے میں یہودیوں کا دعوی ہے کہ اس کو ہیکل کی جگہ پر تعمیر کیا گیا ہے، اس کے لیے وہ عالمی برادری سے دہائی دیتے ہیں، عالمی برادری سے اپیلیں کرتے ہیں کہ وہ ہیکل کی تعمیر کے لیے ان کی مدد کرے تاکہ حق بحق دار رسید ہو سکے، تاکہ وہ توراتی وعدے پورے ہوسکیں جو خود یہودی تحریفات کا نتیجہ ہیں، اس کے لیے وہ کتابیں شائع کرتے ہیں، تاریخ میں تحریفات کرتے ہیں، عالمی پیمانے پر صہیونی اور یہودی فلمیں پیش کرتے ہیں تاکہ اس مسجد اقصی کو ڈھانے کا ان کا حق (ناجائز) ثابت ہو سکے، اور ان کے دعوے (باطل) کے مطابق عالمی برادری ان کے ان مزعوم ہیکل کی تعمیر کی اجازت دے سکے۔

۳۴۔ مسجد اقصی کبھی یہودی ہیکل نہیں تھی بلکہ وہ ہمیشہ امت مسلمہ کی مسجد تھی، اللہ کے نبی حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو تعمیر کی تھی وہ ہیکل کی تعمیر نہیں بلکہ اسی مسجد اقصی کی تجدید تھی، چنانچہ انبیاء کرام میں سے ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور سلیمان علیہم السلام نے اس کی تجدید کی، جیسے کہ فتح فاروقی کے بعد مسلم حکام اس کی تجدیدی تعمیر کرتے رہے۔

۳۵۔ مسجد اقصی ضرور بالضرور مسلمانوں کے ہاتھ میں واپس آئے گی، ان شاء اللہ، یہودیوں سے جنگ بلا شبہ ہوکر رہے گی، مسلمان مجاہدین دجال اور اس کے ساتھ رہنے والے یہود کا خاتمہ کریں گے، اس طرح پوری انسانیت یہودیوں کی حرص وہوس اور ان کی تخریب کاری سے نجات پائے گی اور راحت محسوس کرے گی، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک مسلمانوں یہودیوں سے جنگ نہ کر لیں، پھر مسلمان یہودیوں کو قتل کریں گے، اس وقت پتھر یا پیڑ یہ کہے گا اے مسلمان اے اللہ کے بندے یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے آکر اس کو قتل کردے، سوائے غرقد کے درخت کے کیونکہ وہ یہود کا درخت ہے۔

۳۶۔ مسجد اقصی کا کوئی بھی معاملہ اس دین کے بغیر مکمل نہیں ہوگا، اس کی شان میں اضافہ اس دین کے بغیر نہیں ہوگا، اس کا مقام ومرتبہ اس دین اور اس کے پیرو اور ان موحدین سے مربوط ہے جو نماز پڑھتے ہیں، فرائض دین کو ادا کرتے ہیں، دین میں جن چیزوں کو گناہ قرار دیا گیا ہے ان سے بچتے ہیں، اس لیے کہ نبی کریمؐ نے ارض مقدس کو سب سے بنیادی چیز یعنی اسلام سے مربوط کر دیا ہے، اسلام ہی اس کا مستقبل ہے، اسلام ہی سے اس کی زندگی ہے، سجدہ ریز پیشانیوں اور توحید سے سرشار ومنور دلوں اور وضو کرنے والے ہاتھوں کے لیے خدا کی طرف سے مدد کا وعدہ ہے، اللہ کا ارشاد ہے: وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنّهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذى ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا يعبدوننى لا يشركون بى شيئا ومن كفر بعد ذلك فأولئك هم الفاسقون (النور:۵۵) (اللہ نے ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں ضرور خلافت سے نوازے گا، جس طرح ان سے پہلے (اہل حق) کو خلافت دی، اور ان کے دین کو جس کو ان کے لئے پسند فرمایا ہے، اقتدار عطا کریگا، اور ان کی خوف اور بدامنی (کی حالت) کو امن وسلامتی سے بدل دے گا، (ان پر ذمہ داری ہے) کہ وہ

میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور جو بھی اس کے بعد کفر کریں گے وہ باغی و سرکش ہوں گے۔

۳۷۔ مسجد اقصیٰ کا مسئلہ اور قضیہ فلسطین صرف فلسطینیوں کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ ایک اسلامی قضیہ اور اسلامی ایشو ہے، اس قضیہ پر دنیا کے ہر مسلمان کا حق ہے، اور یہ حق تب سے ہے جب سے اس کی کنجیاں حضرت عمرؓ نے حاصل کیں اور مسلمانوں نے اس کے لیے اپنے خون کی قربانی دی اور اس کو صلاح الدین ایوبیؒ کی قیادت میں صلیبی تسلط سے آزاد کرایا، یہ اوقاف اسلامیہ کی زمین ہے اور یہ امت مسلمہ کی گردن میں امانت ہے۔

۳۸۔ مسجد اقصیٰ صرف مسلمانوں کی ہے چاہے اس پر غاصبانہ قبضہ کی مدت کتنی ہی طویل ہو جائے مگر بالآخر انجام کار تو اہل تقویٰ کے لیے ہے، عنقریب وہ ان شاء اللہ ہمیں واپس ملے گی، یہی اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے اس ارض مقدس کو خیر امت کے لیے بنایا ہے، وہ امت جو سب سے پاکیزہ اور سب سے مقدس پیغام کی حامل ہے، یہ حضرت محمد ﷺ کی امت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ کو آباد کرنے کے لیے منتخب کیا ہے، اس لیے اس امت کے افراد کے دل مسجد اقصیٰ کی محبت سے سرشار رہتے ہیں، اس پر فدا ہونے اور اس کا دفاع کرنے کے جذبہ سے معمور رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے رومیوں کو بھگایا، صلیبیوں کے حملوں کا دفاع کیا اور انھیں شکست دی، اب اگر یہودی مسجد اقصیٰ پر اپنے حق کے دعوے میں سچے ہیں تو ان صدیوں میں وہ کہاں تھے جبکہ مسلمان رومیوں اور عیسائیوں کو پے در پے شکست دے رہے تھے۔

۳۹۔ مسجد اقصیٰ پر صرف مسلمانوں کا ہی حق ہے، اس کی شہادت تاریخ بھی دیتی ہے، حقائق بھی اسی کے موافق ہیں اور آسمان و زمین کی گواہیاں بھی اسی کے مطابق ہیں، چنانچہ اگر دشمن اس کا انکار کرتے ہیں تو اس سے ہمارے عقیدے میں کوئی کمزوری نہیں آتی، اگر ظالم و سرکش افترا پردازی کرتے ہیں تو اس سے ہمارا یقین متزلزل نہیں ہوتا، ہمارا جو حق اور جو دعویٰ ہے وہ شہر القدس کی تاریخ کے عین مطابق ہے، یہ اراضی وقف کی ہے، اس کو بیچنا جائز نہیں، انبیاء کے قاتل اور اللہ کے دشمنوں کو یہ دی جائے اس کا امکان نہیں، ہم یعنی امت مسلمہ اس زمین کے ایک بالشت ٹکڑے سے بھی دست بردار نہیں ہو سکتی، ہم ایسے کسی باطل معاہدے اور جھوٹے دستاویز کو نہیں تسلیم کر سکتے جس کی رو سے یہود ہمارے سردار اور ہمارے مقدسات کے مالک بن جائیں۔

۴۰۔ مسجد اقصیٰ امت مسلمہ کی میراث ہے ،اس لیے اس کی امامت و سربراہی امت مسلمہ ہی کا کام ہے، جو امت شہادت ہے اور جس کو خلافت اراضی کے لیے برپا کیا گیا ہے، خود نبی کریم ﷺ نے اپنی اس امت کی اس جانب رہنمائی فرمائی ہے، اور اس کو مسجد اقصیٰ کی حفاظت پر ابھارا ہے اس لیے کہ وہ حق پر قائم امت مسلمہ کی میراث ہے۔

نبی کریمؐ نے اقصیٰ کی محبت اپنے صحابہ کرامؓ کے دلوں میں جاگزیں فرمائی، ان کو نہ صرف فتح بیت المقدس کی خبر دی بلکہ ان کو اس کی خوشخبری سنائی، ان شاء اللہ مسجد اقصیٰ کی محبت ہمیشہ ہمارے دلوں میں باقی رہے گی، کیوں کہ یہ ہمارے عقیدے کا حصہ ہے، دشمن اس کے نقوش اور اس کی محبت ہمارے دلوں سے مٹانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا چاہے وہ اس کے لیے جس قدر بھی ہاتھ پیر مارے، ان شاء اللہ صبح قیامت تک اس کی محبت ہمارے دلوں میں باقی رہے گی، اس لیے کہ وہ مومنین کے لیے بہترین ٹھکانہ اور طائفہ منصورہ کا مقام ہے۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

زبان و کلام کی نشوونما: ہم بڑوں کا حال یہ ہے کہ ہمارے پاس عبارتوں اور کلمات کی ایک دنیا ہے، ہم ہر طرح کی گفتگو کرتے اور سنتے ہیں اور اسے اپنی روز مرہ کی زندگی میں ایک معمول کی چیز سمجھتے ہیں، جیسے چلنا اور سانس لینا ایک معمول کی چیز ہے، حالانکہ گفتگو کی اہمیت اور قیمت اس سطحی تصور سے بہت زیادہ ہے، زبان صرف دوسروں کو مخاطب کرنے کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ ہم میں سے ہر آدمی کے ذاتی تشخص کا اساسی و بنیادی حصہ ہے، اسی طرح وہ پڑھنے لکھنے، افکار وخیالات کو ضبط میں لانے، زندگی اور دنیا میں غور وفکر کرنے، انہیں سمجھنے نیز اپنے متعلقین اور خود کو سمجھنے کا وسیلہ ہے، یہی نہیں بلکہ اس زبان کے ذریعہ ہم اپنے خالق رب کریم کا کلام سمجھتے ہیں۔

یہ بہت عام بات ہے کہ والدین عام طور پر اپنے بچوں کے ساتھ اولین دنوں اور ہفتوں میں گفتگو کرتے ہیں، کبھی کبھی اس کے لیے وہ لوریاں اور گیت گاتے ہیں، یہ سب چیزیں بچے کو اپنے آس پاس کی انسانی آواز سے مانوس ومتعارف ہونے میں مدد کرتی ہیں، اس کو اپنی خاص نوعیت کی آوازیں نکالنے پر ابھارتی ہیں، خواہ وہ اپنی بھوک اور اپنی تکلیف کے اظہار کے لیے آواز نکالے یا محض کھیل اور تسلی کے سبب آوازیں نکالے، البتہ عمر کے چوتھے یا چھٹے مہینے میں جبکہ بچہ خوب آوازیں نکالنے لگتا ہے اور خوب خوش ہوکر کلکاریاں مارتا ہے تو اس دنیا کے حسن اور خدا کی عظمت وبلندی اور انسانوں پر اس کی بے پناہ مہربانی کا احساس دو چند ہوجاتا ہے، بچہ اپنی اس نئی مہارت سے خوب لطف اندوز بھی ہوتا ہے، یوں ہی آوازیں نکالنے کا یہ مرحلہ بچے میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے، اس قدرتی مہارت اور اس کے ظہور کا اس کے والدین کی زبان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، چنانچہ دنیا کے تمام بچے خواہ ان کا اس کی زبان وتہذیب کچھ بھی ہو، اس مرحلے سے ضرور گزرتے ہیں اور سب کے سب ایک جیسی آوازیں نکالتے ہیں، یہاں تک کہ پیدائشی طور پر جو بچہ بہرا ہوتا ہے وہ بھی ابتدائی مرحلہ میں یہی آوازیں نکالتا ہے، اللہ کا ارشاد ہے وعلم آدم الاسماء کلھا (بقرہ:۳۱)

صحیح بات یہی ہے کہ یہ آوازیں بچہ کی معاشرتی نشو ونما پر دلالت نہیں کرتیں، چنانچہ بچہ یہ آوازیں والدین کی موجودگی میں بھی نکالتا ہے اور عدم موجودگی میں بھی، اس ابتدائی مرحلہ میں یہ آوازیں بچے کے لیے لوگوں سے اجتماعی تواصل کا ذریعہ نہیں ہوتیں، ظاہر ہے کہ زبان ٹوٹنے سے قبل اور بات کرنے کی

صلاحیت سے پہلے آوازیں نکالنے کا یہ مرحلہ عبوری ہوتا ہے جس کے بہت تھوڑی مدت کے بعد بچہ اپنی زندگی کے پہلے کلمات بولنے لگتا ہے، البتہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک بچہ جس طرح پہنچتا ہے وہ زندگی کے عجائبات اور خدا کے کرشموں میں سے ہے۔ الفاظ بہت سے پیچیدہ اور مرکب افعال کا ایک حصہ ہوتے ہیں،، چنانچہ یہ وہ اصوات ہیں جن کے ذریعے ہم اشیاء اور واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور انسان کو ان آوازوں کے مدلول اور اشارات کو سمجھنے کے لیے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس مرحلہ کی کیفیت کو جاننے کے لئے مختلف نظریات و تفصیلات ہیں۔

جس وقت سے بچہ آوازیں نکالنا شروع کرتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ اس کی بعض آوازیں ان آوازوں سے ملتی جلتی ہیں جو وہ اپنے والدین سے سنتا ہے، پھر وہ ان آوازوں کو گوشۂ ذہن میں محفوظ کر لینے کی اور دوہرانے کی کوشش کرتا ہے، اس کے ساتھ وہ ان آوازوں کو چھوڑنا شروع کر دیتا ہے، جن کو وہ اپنے گردوپیش کے ماحول میں نہیں سنتا ہے، اس مرحلہ میں عرب بچہ چینی، انگریزی اور ہندی وملیشیائی بچہ سے مختلف ہونا شروع ہوجاتا ہے۔

آوازیں نکالنے کے مرحلہ میں بچہ دنیا کی کسی بھی زبان کو سیکھ سکتا ہے، اس لیے کہ اس مرحلہ کی آوازیں متنوع ہوتی ہیں، اور بچے کے اندر کسی بھی حرف کا تلفظ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، البتہ تھوڑی مدت کے بعد اس کی آوازیں اپنے والدین یا اپنی قوم سے سنی ہوئی آوازوں میں محدود ہوجاتی ہیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آوازیں نکالنے کے بعد کا جو وقت ہوتا ہے اس مدت میں ایسا بچہ خاموش رہنا شروع کر دیتا ہے جو قوت سماعت سے محروم ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے والدین اور اپنے گردوپیش کی آوازیں نہیں سنتا ہے، وہ ان آوازوں کو سننے سے قاصر ہوتا ہے جنھیں سن کر وہ تقلید کرتا اور دوہراتا ہے، حتی کہ ''گوں گاں'' کرنے کے زمانے میں بھی وہ جو آوازیں نکالتا ہے خود اس کو اس کا ادراک نہیں ہوتا، اسی لیے ابتدائی مراحل میں ہی ہمیں قوت سماعت کا چیک اپ کرانا چاہیے، بعض اوقات اس کا علاج ممکن ہوتا ہے، اس طرح ہم بچہ کی آوازیں نکالنے کے مرحلہ سے کلمات سیکھنے اور گفتگو کرنے کے مرحلہ کی طرف آنے میں مدد کر سکتے ہیں، اگر جلد ہی بچہ کی سماعتی کمزوری پر تنبہ نہ ہو اور اس کا ممکن علاج نہ کیا جائے، پھر بچہ مکمل طور پر خاموش رہ جائے، تو ممکن ہے اس کے نتیجہ میں وہ کوئی زبان کیا سیکھتا بلکہ وہ آواز نکالنے کی ہی قدرت کھو دے اور پھر وہ گونگا رہ جائے، سوائے اس کے کچھ غیر مرتب اور نہ سمجھ میں آنے والے الفاظ و جملے نکال سکے۔

ابتدائی مراحل میں کلام کی نشو ونما:

جب بچہ اپنی عمر کے ابتدائی مہینوں میں آواز نکالنے کے مرحلہ میں داخل ہوجائے، تو بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے آس پاس آوازیں سنے، الفاظ اس کے کانوں میں پڑیں، گفتگو اس کی سماعتوں سے ٹکرائے، اس مرحلہ میں والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس سے باتیں کریں، اس کو اپنی آواز سنائیں، مثلا ماں جب روز مرہ کے کام انجام دے تو زبان سے اس کو بتانے اور سمجھانے کی کوشش کرے کہ وہ کیا کر رہی ہے، اس کو بتائے کہ اس کو کتنا پیار کرتی ہے، گھر میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے متعلق اس سے گفتگو کوتی رہے، پھر رفتہ رفتہ اس سے اس کی منشا معلوم کرے خود اس کے کاموں میں یا گھر کے کاموں سے متعلق اس طرح گویا وہ سمجھ رہا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ وہ سنے گا

اس کو نہیں سمجھے گا، لیکن ماں دیکھے گی کہ جب وہ اس سے بات کرتی ہے تو کس طرح وہ اس کی جانب دیکھتا ہے، ماں غور کرے کہ وہ کس طرح اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتا ہے، اس کو محسوس ہوگا گویا وہ بڑی توجہ سے سن رہا ہے، کبھی کبھی تو نظر آئے گا کہ وہ ماں کی بات سن کر اس کو بڑے تعجب سے دیکھ رہا ہے، گویا اس کے چہرے پر حکمت و معرفت کی علامات ظاہر ہوتی ہیں کہ ماں اس سے جو چاہتی ہے وہ اس کو جانتا ہے۔

ماں کے لئے یہ بات بھی ممکن اور مفید ہے کہ بچہ جو آواز نکالے وہ اسی آواز کو دہرائے، اور اس کو سنائے، پھر وہ دیکھے گی کہ بچہ خود اس آواز کو دہرائے گا تاکہ ماں اس کے لیے پھر وہ آواز نکالے، اس طریقے سے اس میں آواز نکالنے، حروف نکالنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور تسلسل کے ساتھ حروف نکالنا سیکھ سکے گا، یہی نہیں اس سے بچہ میں اپنے حلق اور منہ پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا ہوگی، قوت سماعت اور مشاہدہ کی استعداد مضبوط ہوگی۔

کبھی یہ بھی ہونا چاہیے کہ ماں باپ بچے کے ساتھ بیٹھ کر طویل گفتگو کریں، اس کے لیے کوئی آواز نکالیں، اور پھر اس کے جواب کا انتظار کریں، دیکھیں کہ وہ گفتگو کے موضوع سے متعلق کیا لفظ زبان سے نکالتا ہے، یاد رکھنا چاہیے کہ اس سے صرف زبان اور گفتگو کرنے کی صلاحیت کا نشو نما نہیں ہوگا بلکہ اس سے اجتماعی صلاحیت اور دوسروں کے ساتھ معاملات کرنے، ان سے تعلقات بنانے اور ان کی توجہ حاصل کرنے کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے۔

یہ فطری بات ہے کہ بچہ یک بیک تمام الفاظ و کلمات نہیں ادا کرنے لگے گا، وہ آہ، اوہ کرے گا، پھر بابا، ماما پر آئے گا، بسا اوقات وہ ان ہی الفاظ کو دہراتا رہے گا، پھر دادا، نانا، ماما کے الفاظ نکلیں گے، آپ دیکھیں گے کہ حروف ساکنہ سے پہلے صوتی حروف نکالے گا، یہ بھی فطری بات ہے کہ بچے کے بابا، ماما کہنے سے اہل خانہ کو خوشی ملتی ہے کیوں کہ ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ بچہ اپنے ماں باپ کے متعلق گفتگو کر رہا ہے، ابتدا میں تو بچہ یہ آوازیں یا الفاظ بغیر کچھ سمجھے ہوئے نکالتا ہے لیکن بعد میں وہ والدین کے مسرت کے ساتھ دہرانے کے سبب یہ الفاظ یہ سمجھ کر نکالتا ہے کہ یہ الفاظ ماں باپ پر دلالت کر رہے ہیں، اس طرح بچہ کے منہ سے ادا ہونے والے یہ پہلے الفاظ ہیں، اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے کہ والدین آوازیں نکالنے کے مرحلہ میں بچے کی آواز کے مشابہ آوازیں نکالیں بلکہ ان کو یہ کام سب کو فائدہ پہنچانے اور تفریح طبع کے لیے کرنا چاہیے۔

اگر بچہ یہ آوازیں نکالنے میں کچھ تاخیر کرے تو والدین کو پریشان نہیں ہونا چاہیے، یہ مرحلہ ۴ سے ۶ ماہ کے درمیان شروع ہوتا ہے جبکہ بعض بچے ۶ ماہ بعد آوازیں نکالنا شروع کرتے ہیں، البتہ اب تک جلدی آوازیں نکالنے اور جلدی زبان سیکھنے یا اچھی اور عمدہ زبان بولنے کے درمیان کوئی تعلق ثابت نہیں ہو سکا ہے، پھر آواز نکالنے کے مرحلہ کی ابتدا بچے کے طبعی نمو کی بھی مکمل علامت نہیں ہے، اس سے یہ سمجھنا بھی ممکن نہیں کہ اس کو کوئی پریشانی ہی نہیں ہے، اس طرح کی آوازیں تو بہرے بچے بھی نکالتے ہیں۔ وہ بچے بھی اس طرح کی آوازیں نکالتے ہیں جو بعد میں اپنی عقلی کمزوری یا جسمانی معذوری (Physical Disability) کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آواز نکالنے کا مرحلہ ایک اچھی علامت نمو ہے، اس تفصیل کے باوجود اگر والدین کو بچے کے نشو نما کو لے کر پریشانی کا احساس

ہو رہا ہو تو انھیں پہلی فرصت میں بچوں کے ڈاکٹر Child Specialist سے رابطہ کرنا چاہیے۔

عام طور پر یہ مرحلہ ۸ ماہ تک رہتا ہے، رفتہ رفتہ جب بچہ مناسب کلمات کی ادائیگی شروع کرتا ہے تو یہ مرحلہ ختم ہوجاتا ہے، لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ بچہ یہ مرحلہ ختم ہونے کے بعد بھی اس طرح کی آوازیں نکالے، خواہ اپنے کھلونوں سے کھیلتے ہوئے، یہ اپنے آس پاس کسی کو تصور کرتے ہوئے، بسا اوقات بچہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ بھی ایسی آوازیں نکالتا ہے کہ جیسے وہ اس مرحلہ میں واپس آ گیا ہو، اس میں ڈرنے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے، اور نہ ہی اس عمل پر اس کو ڈانٹنے سے کوئی فائدہ ہوگا، بلکہ بہت نرمی کے ساتھ اس سے یہ کہنا چاہیے ''بہتر ہے آپ کی چھوٹی بہن اسی طرح بولتی ہے''۔ ساتھ ساتھ والدین کو اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے مناسب کلمات کا استعمال کرنا چاہیے، جو بچوں کی ان آوازوں سے مختلف ہوں، جو بچے نکالتے ہیں، اس میں بہت زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہے یہ مرحلہ چند مہینوں میں ختم ہوجاتا ہے۔

کبھی کبھی بچہ یہ طفلانہ آوازیں کسی چیز سے عاجز ہوکر نکالتا ہے، یا والدین سے کسی چیز کا مطالبہ کرتے ہوئے نکالتا ہے، کیوں کہ وہ ان آوازوں میں اپنے لیے سکون وراحت اور اعصابی تقویت کا سامان پاتا ہے، اگر ایسا کبھی کبھی ہو تو والدین کو اس پر توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر ایسا بار بار ہو تو مطلب یہ ہے کہ بچے کو کوئی پریشانی ہے، وہ پورے طور پر پُرسکون نہیں ہے، وہ کسی چیز سے بھاگ کر اپنے ایام ماضی میں پناہ لینا چاہتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے بچپن کو زیادہ مامون سمجھ رہا ہے، جبکہ وہ یہ آوازیں نکالا کرتا تھا اور انھیں پسند کیا جاتا تھا، اس موقع پر والدین کو جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کس چیز سے اس کو پریشانی ہو رہی ہے اور کیوں وہ اس مرحلہ کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔

ہمیں ''فعال زبان'' اور ''غیر فعال زبان'' کے درمیان فرق کرنا پڑتا ہے، فعال زبان یہ ہے کہ بچہ جن کلمات کو ادا کرتا ہے انھیں بشکل فاعل استعمال کرتا ہے، جبکہ غیر فعال زبان یہ ہے کہ بچہ ان کلمات کو سنتا ہے اور سمجھ لیتا ہے مگر ان کو زبان سے ادا نہیں کر پاتا، یہ فطری بات ہے کہ غیر فعال زبان کا نمو فعال زبان سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہونا چاہیے بچہ جب غیر فعال زبان کا استعمال شروع کرتا ہے، تو اکثر وبیشتر وہ اس کو فاعل کی شکل میں ہی استعمال کرتا ہے، یہ بات ہر انسان پر منطبق ہوتی ہے جو کوئی بھی دوسری نئی اجنبی زبان سیکھتا ہے تو ایسا ہی کرتا ہے۔

بچہ جب گفتگو کرے تو آپ غور کیجئے کہ وہ کس طرح بتدریج اپنے کلام کو زبان کے قواعد کے مطابق منضبط کرتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ محض بڑوں کی تقلید سے زبان کے قواعد نہیں سیکھ لیتا، بلکہ پہلے مرحلہ میں وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے مناسب حال قواعد زبان سیکھ لے، بچوں کی بہت سی جو لسانی غلطیاں بہ اعتبار قواعد شمار کی جاتی ہیں وہ اس کا نتیجہ ہوتی ہیں کہ جو قواعد وہ سیکھتا ہے ان کو اپنی گفتگو میں منطبق کرنا چاہتا ہے، مثلاً ''مجھے دیجئے'' کہنے کے بجائے وہ کہتا ''میں سیب''، ابو آ گئے، کہنے کے بجائے ''ابو گئے'' کہتا ہے، توجہ طلب یہ ہے کہ ایسے مواقع پر بچوں کی غلطیوں کی بہت نرمی اور شفقت سے اصلاح کرنی چاہیے، ہرگز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ اس کو کلمات کے استعمال، اور نئے جملوں کا تجربہ کرنے سے روک دیں، بلکہ کوشش کیجئے کہ اس کو احساس دلا سکیں کہ آپ اس کی گفتگو کو سننا پسند کرتے ہیں، اور آپ چاہتے ہیں کہ وہ صحیح طریقے سے اپنی

بات کہنے اور مافی الضمیر ادا کرنے پر قادر ہو جائے۔

زبان کے استعمال کے سلسلہ میں بہت اہم مرحلہ وہ ہوتا ہے جب بچہ ضمائر کا استعمال شروع کرتا ہے، بسا اوقات اس کو ضمائر کے درمیان فرق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، مثلا جب آپ اس سے گفتگو کرتے ہیں تو ''تم اور تمہارے لیے'' استعمال کرتے ہیں، اس لیے جب وہ آپ سے اپنی کوئی بات کہتا ہے تو ''میں اور میرے لیے'' کی جگہ وہ ''تم اور تمہارے'' کا استعمال کر جاتا ہے، والدین کو ان غلطیوں کی تصحیح میں شدت نہیں برتنا چاہیے، اس لیے کہ بچہ خود ہی تھوڑے دنوں میں ان استعمالات کے درمیان فرق کو سمجھنے لگے گا، اس مرحلہ میں اہم یہ ہے کہ وہ بولنے کی کوشش کرے، زبان کا استعمال کرے، کوشش اور تجربہ میں دوام و تسلسل ضروری ہے بجائے اس کے کہ صحیح استعمال کی شرط لگائی جائے، اس شرط سے خطرہ ہے کہ نہ وہ بولے گا اور نہ زبان کا استعمال کرے گا۔

یہی مسئلہ حروف اور کلمات کے تلفظ میں غلطی کرنے کا ہے، بسا اوقات بچہ کسی سے غلط استعمال اور غلط تلفظ سنتا ہے اور ویسے ہی بولنے لگتا ہے، اہم بات یہ ہے کہ آپ اس کو زبان کے منافع باور کرائیں، یہ بتائیں کہ زبان کے استعمال سے کس طرح وہ دوسروں کو مخاطب کر سکتا ہے، بچہ اگر کسی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اپنی کوئی خاص ترکیب استعمال کرتا ہے تو بھی اچھی بات ہے کہ گویا اس نے یہ نکتہ پالیا ہے کہ حروف و کلمات کے ذریعہ اشیاء کی طرف اشارہ کرنا نہ صرف اہم بات ہے بلکہ یہ انسان کو عطا کردہ خالق کی عجیب قدرت کا مظہر بھی ہے۔

ذرا سوچیے کہ بچہ ایک سادہ سا لفظ ''لڑکا'' کیسے سیکھتا ہے جب ہم خاص اس کی طرف اشارہ کرنا چاہیں، یا کسی بھی لڑکے کی طرف خواہ وہ باہر کے ہوں، تصویروں میں ہوں، رنگ و عمر میں اور شکل میں مختلف ہوں، ان تفصیلات سے ہم اب آگاہ نہیں ہو سکتے اس لیے کہ ہم عمر کے اس مرحلہ سے نکل آئے، یہ معاملہ افعال کے استعمال میں اور زیادہ مشکل و پیچیدہ ہو جاتا ہے، مثلا جب ہم کسی پیچیدہ مرکب کام کو کسی ایک صوتی لفظ سے بیان کرنا چاہتے ہیں جیسے ''کھانا'' اسی طرح مختلف زمانوں کا استعمال اور صفات کے استعمال کا معاملہ ہے، اس سے ان بچوں کی ذہانت کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے، کہ کیسے زندگی میں پہلی مرتبہ وہ یہ سب کچھ سیکھ لیتے ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ جب بچہ صحیح طریقہ سے گفتگو کرنے پر قادر ہو جائے تو اہل خانہ اس کے اختیار و ایجاد کردہ الفاظ و جملے بولنے خود تو گریز کریں البتہ اسے ابھی بھی بعض الفاظ بولنے دیں، اور اس سلسلے میں فکر مند نہ ہوں اس لیے کہ نشو و نما کے ساتھ ساتھ بغیر مشکلات کے وہ اس مرحلہ سے بھی نکل جائے گا۔

عام طور پر تین سے سات سال تک کے بچوں میں دیکھا جاتا ہے کہ وہ بعض الفاظ کے بڑے گرویدہ ہوتے ہیں وہ انھیں یاد کر لینا چاہتے ہیں، خصوصا اسماء سے ان کو بڑی دلچسپی ہوتی ہے، وہ ناموں کو دہراتے رہتے ہیں، بسا اوقات وہ ان میں ایسے حروف یا آوازوں کا اضافہ کر دیتے ہیں جس سے وہ گنگنا سکیں اور پھر گنگناتے رہتے ہیں، دہراتے رہتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ ان میں لہجہ اور مخارج کا شوق پیدا ہوتا ہے، اس مرحلہ میں ان کو تلفظ و تکرار سے روکنا سود مند نہیں ہے، اس لیے کہ اس پورے عمل کی حیثیت بچوں ک لیے ایک دلچسپ کھیل سے زیادہ نہیں۔

☆☆☆

❑ تحریک آزادی

آزادئ ہند میں مسلمانوں کا کردار

محمد قمر الزماں ندوی

ایمان ویقین اور عمل صالح کے بعد اگر کوئی نعمت سب سے زیادہ قابل ذکر اور قابل تعریف ہے تو وہ آزادی کی نعمت ہے- شاعر نے اسی لئے تو کہا ہے:

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو ہے خوف ذلت کے حلوہ سے بہتر

اور اس کے مقابلے میں غلامی سب سے زیادہ ذلت اور رسوائی کی چیز ہے، غلامی جرم کا شاخسانہ ہے، آزادی سے محرومی بہت بڑا نقص اور کمی ہے، آزادی کے بغیر انسان کی حیثیت دوسرے کی نظر میں کٹھ پتلی کی ہے، بلکہ اس سے آگے یہ کہا جائے کہ غلام کی موت و زندگی سب یکساں ہے، اور آقا اور مالک کی ماتحتی میں غلام کی حیثیت گویا مردے کے ہاتھ میں زندہ- غلام کو کوء مقام اور درجہ حاصل نہیں ہوتا اس کی اپنی کوئی ملکیت نہیں ہوتی، وہ کسی کا مالک، سرپرست اور ولی نہیں ہوسکتا، گواہی میں اس کا کوئی اعتبار نہیں، وہ خرید وفروخت بغیر آقا کی مرضی اور اجازت کے نہیں کرسکتا، اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلسل غلامی سے انسان کے فکر ونظر خیال وسوچ میں سطحیت آجاتی ہے، پرواز فکر وخیال کی ساری صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے- اسی لئے تو تو حکیم دانا اقبال مرحوم نے کہا تھا:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ہمارا ملک ہندستان بھی آج سے ستر سال پہلے ناپاک انگریزوں کے قبضہ میں تھا- اس سے پہلے یہ ملک اسلامی حکومت کے زیر نگیں رہا لیکن ہمارے حکمرانوں کی نااہلی، آپسی خانہ جنگی اور عیش کوشی اور عیاشی کی وجہ سے اس وسیع ترین اسلامی سلطنت سے ہم مسلمانوں کو محروم ہونا پڑا جس کی کہانی بڑی دلخراش ہے- الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اس ملک میں ایک دور اسلامی سلطنتوں کے قیام کا ہے اور دوسرا تاریک ترین عہد برطانوی اختیار کا ہے- یہاں برطانوی حکومت کیسے قائم ہوگئی اسلامی حکومت کو شکست اور ناکامی کا سامنا کیوں اور کیسے کرنا پڑا، اپنوں نے کیسے خنجر گھونپے، اور غیروں کی کیا عیاری رہی اس کی ایک طویل داستاں ہے- خلاصہ یہ کہ جب برطانوی ڈپلومیسی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی دسیسہ کاریوں کے نتیجہ میں مغل سلطنت کا خاتمہ ہوگیا تو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمان اور علماء اس حکومت کی بحالی اور اسلامی اقتدار کے لئے سینہ سپر ہوگئے- خود غدر کا ہنگامہ جو درحقیقت استخلاص وطن کی ایک پاکیزہ کوشش تھی، اور جسے مکار انگریز نے عیاری سے .. غدر .. کا نام دیا- اس میں علماء کی جماعتیں اطراف و جوانب سے آکر دہلی میں انگریز فوجوں سے دست بدست لڑ رہی تھیں-

اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ آزادی کی لڑائی میں سب سے زیادہ قربانی مسلمانوں کی رہی، سب سے اہم اور بے مثال کارنامہ مسلمانوں نے انجام دیا اور سب سے آگے آگے علماء

کرام رہے۔اگر آزادی ہند میں مسلمان اور خصوصا علماء کرام حصہ نہ لیتے تو ہندستان کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا، تحریک آزادی نہ چلتی، تحریک بالاکوٹ کا وجود نہ ہوتا تحریک ریشمی رومال کی بنیاد نہ پڑتی تحریک خلافت کا غلغلہ نہ ہوتا، ہندستان چھوڑو تحریک کا زور وشور نہ ہوتا، اگر مسلمانوں نے اپنے پاکیزہ لہو سے شجر آزادی کی آبیاری نہ کی ہوتی اور اپنے خون جگر سے عروس آزادی کی حنا بندی نہ کی ہوتی تو آج ہم آزادی کا اکہترویں جشن آزادی جو منا رہے ہیں-نہیں منا پاتے۔

ہم یہ نہیں کہتے اور یہ کہنے کا ہمیں بالکل جواز نہیں ہے کہ ہمارا یہ ملک صرف ہماری ہی کوششوں سے آزاد ہوا ہے-ایسا کہنا تاریخ کو منھ چڑھانا ہوگا-ہاں یہ سچ ہے کہ آزادی کا صور مسلمانوں نے پھونکا، انگریز کے خلاف جہاد کا فتوی علماء نے دیا، آزادی کی لڑائی کی شروعات مسلمانوں نے کی اور جب اس چنگاری نے شعلہ کی شکل اختیار کرلی تو برادران وطن بھی ہمارے ساتھ ہوگئے اور پھر انھوں نے بھی شانہ بشانہ ہمارا ساتھ دیا اور ہر طرح سے اس لڑائی میں کود گئے-ہم کہ سکتے ہیں کہ:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
راہ رو آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اور یہ کہ

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

علماء کرام نے آزادی کی لڑائی میں سب سے زیادہ قربانی دی اور بے مثال کارنامہ انجام دیا-اس کی شہادت ایک انگریز مورخ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن سے سنئے-:

وہ لکھتا ہے: ''کہ 1864ء سے لیکر 1867ء تک انگریز نے علماء کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ تین سال ہندستان کی تاریخ کے بڑے المناک سال ہیں، ان تین سالوں میں انگریزوں نے چودہ ہزار علماء کو تختۂ دار پر لٹکایا'' آگے لکھتا ہے کہ ''دلی کے چاندنی چوک سے لے کر خیبر تک کوئی ایسا درخت نہ تھا جس پر علماء کی گردنیں نہ لٹکی ہوں''

یہ تو اس سلسلہ کی صرف ایک کڑی دکھائی گئی ورنہ تو ہندستان کے لاکھوں علماء ہیں آزادی کے لئے ان کے غیر فانی کارنامے ہیں۔جنکی قربانیاں اور بلند حوصلگی جن کا عزم اور تڑپ تاریخ کے صفحات میں درج ہے۔

واسرائے ہند لارڈ ڈفرن کے زمانہ میں کانگریس کا قیام عمل میں آیا-جس کی ابتداء برطانوی اقتدار کے لئے نیک خواہشات کا اظہار اور دبے بھینچے الفاظ میں اپنے حقوق کی دریوزہ گری تھی-مطالبۂ حقوق کا تو یہ تصور نہیں کر سکتے تھے-سب سے پہلے جس شخص نے آزادئ کامل کا ریزولیشن پیش کیا وہ سید فضل الحسن حسرت موہانی رح تھے-اور کس ماحول میں جبکہ کانگریس کے شیسن میں بڑے بڑے مہاتما حسرت موہانی کے اس اقدام پر کانپ پڑے تھے-سالہا سال تک کانگریس مکمل آزادی کے مطالبے کے قریب نہیں آئی۔یہ مسلمانوں ہی کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے اس جماعت کو آزادی کی لڑائی میں جرأت آزما بنا دیا-(مستفاد تقریر از مولانا کشمیری رح)

خیر طویل جد و جہد اور قربانی کے بعد آزادی کی یہ لڑائی تو ہندستان کے لوگ اور باشندے جیت گئے اور آزادی کا آفتاب غلامی کے تیرہ وتار فضا کو چھانٹتا ہوا عقب سے طلوع تو ہوگیا-لیکن ہندستان اس طرز کی آزادی حاصل کرنے سے محروم رہا جو ہمارے علماء کا منصوبہ اور مقصد تھا-اور بقول گھر کے ایک گواہ کے:

''آزادی آئی مگر خونچکاں بن کر۔بجائے بہار بدوش ہونے کے خزاں بدامن۔جس کے نتیجہ میں وہ تباہی آئی اور آرہی ہے اور اس بربادی سے سابقہ ہو رہا ہے۔جس کی مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔

☆☆☆

❑ فکر اسلامی

(قسط-۱۸)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نا عاقبت اندیشی پر سخت تنقید:

سازشیں تو سازشیں ہوتی ہیں، ہماری ملی تاریخ ان سے پُر ہے، مولانا نے ذہنی انتشار، کردار کشی کی مہم اور شریعت اسلامی کے بارے میں بے اعتمادی اور پریشان خیالی کی وضاحت کی ہے، فقہی جزئیات کو عوامی بحث اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہونے والے خطرات ونقصانات کا تذکرہ کیا ہے، ایک طرف مسلم پرسنل لا کا کام اور اس کی کامیابی کا تذکرہ کیا ہے اور پھر جو لکھا ہے وہ انجام سے ناواقفیت، بے محل گفتگو، خطرات سے آگاہ نہ ہونے یا پھر کسی سازش کا ہی حصہ ہوسکتا ہے، مولانا بہت کرب کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

''اب اس کا مقابلہ دل پر ہاتھ رکھ کر اور ندامت سے کچھ گردن جھکا کر اس سے کیجئے کہ جب پرسنل لا بورڈ اپنا اصلاحی اور تعمیری کام کر رہا تھا، اصلاح معاشرہ کی تحریک ملک میں چلائی جا رہی تھی، جس کی، جہیز کے مطالبہ، اسراف وفضول خرچی اور نمود ونمائش کی موجودگی میں جو اپنی آخری حد سے بڑھ گئی ہے، سخت ضرورت تھی، اور عائلی قانون، نکاح وطلاق کے بارے میں صرف غیر مسلموں ہی میں بے وقعتی نہیں، بلکہ مسلمانوں میں بھی بے اعتمادی پیدا کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی، ایک طلاق اور تین طلاقوں کی بحث چھیڑ دی گئی، جس کا اخبارات اور چوراہے پر آنے کا کوئی موقع نہ تھا، اگر غور وفکر اور علمی تحقیق کی کوئی دعوت دینی تھی تو اس کا محل ومقام، علمی وفقہی مجالس، سیمینار اور علمی مذاکرات کے مواقع اور مرکزی اور بلند پایہ دارالعلوم اور مدارس عربیہ کے دارالافتاء اور اس کے ماہرین تھے۔

لیکن بڑے افسوس ومعذرت کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ بعض مکاتب خیال اور جماعتوں کی طرف سے ایک مجلس کی ایک طلاق اور تین طلاقوں کا مسئلہ اخبارات کے صفحات پر آ گیا، اور چوراہوں پر اٹھایا گیا، اردو اخبارات میں سطحی معلومات رکھنے والے اور قلم سے کام لینے والے اصحاب یہاں تک کہ خواتین کے مراسلے اور قلم برداشتہ تحریریں چھپنے لگیں اور مشکل سے کوئی دن اس سے خالی جاتا، ان تحریروں اور مضامین میں طنز وتحریض اور ایسے جارحانہ اندازِ تحریر کو اختیار کیا گیا، جس سے کم سے کم عوام کے دل میں شریعتِ اسلامی اور اس کے مثالی ومعیاری دور اور اس کے ماہرین اور نمائندوں کی طرف سے شکوک وشبہات پیدا ہوں، اور وہ ایک بیت بازی اور اظہار ذہانت وخطابت کا موضوع بن جائے۔

اس کا ایک افسوسناک بلکہ شرمناک نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی اور انگریزی اخباروں کو طنز وتحریض بلکہ تمسخر کا ایک موضوع اور مسلمانوں کے دینی نظام اور اسلامی شریعت وقانون کی توہین وتذلیل کے لئے ایک حربہ مل گیا، جن لوگوں نے ان دنوں

میں ہندی و انگریزی اخبارات کے تبصرے، اس سلسلہ کے لطیفے، چوٹیں اور چٹکیاں اور ان واقعات کا، جو نفس طلاق کے ایک ظالمانہ فعل ہونے، اور مطلقات کی بے کسی و بے بسی اور مسلمانوں کا بطور تفریح کے اس سے کام لینے کے ثبوت میں لکھے گئے ہیں، کا مطالعہ کیا ہے، ان کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے، اور اسلامی شریعت کی اس توہین وتذلیل کو پڑھ کر ان کا خون کھولنے لگتا ہے، اور ان کی پیشانی عرق آلود ہوجاتی ہے، اور ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کا موقعہ اس عجلت اور جذباتیت اور کوتاہ اندیشی نے دیا، جو ہمارے بعض علمی حلقوں اور مکاتبِ خیال کی طرف سے ظاہر ہوئی۔ (کاروان زندگی ج ۵ ص ۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵)

ملت کی سیاسی رہنمائی:

مولانا کے اندر ایک تڑپ تھی، ملت کا درد تھا، اور وہ درد بھی بے لوث تھا، اس کے پیچھے بھی خالص جذبۂ خدمت کارفرما تھا اس لئے بغیر کسی تشہیر کے بسا اوقات بڑے سے بڑے اقدام کرتے تھے، ہندوستان کے مزاج اور سیاسی ضرورت سے کبھی مولانا نے چشم پوشی اختیار نہیں کی، اور ایک قائد، صاحب فکر رہنما، دل دردمند رکھنے والے صاحب بصیرت سے یہ اہم قومی ضرورت بالخصوص اس ملک میں کیسے اوجھل ہوسکتی تھی، چنانچہ ۱۹۹۳ء کے حالات ذہن میں رکھیے اور مولانا کی سیاسی رہنمائی، بصیرت اور بروقت اقدام سے سبق حاصل کیجئے:

''ان انتخابات کے سلسلہ میں راقم کی (اپنے امکانی حدود و سائل تک) یہ کوشش رہی کہ سیاسی پارٹیوں میں سے وہ پارٹیاں جو ملک اور اس کے باشندوں کو متحد، پر امن، حقیقت پسند اور ہندوستان کی آبادی کے دو سب سے بڑے عنصر ہندو اور مسلمانوں کو ملک کی تعمیر و ترقی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے والا، فرقہ ورانہ فسادات سے متنفر اور معاشرہ و انتظامیہ کو ان خرابیوں اور ان امراض سے دور دیکھنا چاہتی ہیں جنھوں نے زندگی کو دشوار، ملک کو بدنام اور فضا کو مسموم و مکدر بنا رکھا ہے، جس کی موجودگی نے (جیسا کہ بارہا تقریروں میں کہا جاچکا تھا) انگریزوں کے دور غلامی کو یاد کرنے اور اس کو ترجیح دینے کا رجحان پیدا کردیا تھا، باہم متحد ہوجائیں، ملک اس وقت گویا کوہ آتش فشاں کے دہانہ پر کھڑا ہے، پھر بدنظمی، رشوت خوری، دولت پرستی و جانب داری اپنے شباب پر پہنچ گئی ہے۔

اس سلسلہ میں تین ہی پارٹیوں پر نظر پڑتی تھی، سماج وادی، بہوجن سماج اور جنتا پارٹی، راقم نے ان تینوں پارٹیوں کے رہنماؤں سے الگ الگ گفتگو کی اور ان کو اس پر آمادہ کرنے کی مخلصانہ کوشش کی کہ وہ متحد ہوکر ایک محاذ بنائیں، اور ملک و معاشرہ کو اس ہمہ گیر زوال سے بچانے کی کوشش کریں جو تاریخ میں مختلف ممالک، سلطنتوں اور معاشروں (Societies) کو پیش آیا ہے، اور جس نے بڑی بڑی شہنشاہیوں (Empires) اور تہذیبوں (Cultures) کا چراغ گل کردیا ہے۔

پھر ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ (B.J.P) کسی طرح مرکز اور ریاستوں میں برسرِ اقتدار نہ آنے پائے، جس کے مقاصد، منصوبوں اور اعلانات کا تفصیل سے ذکر کتاب کے پچھلے صفحات میں آچکا ہے، اور جس کا مرکزی نقطہ مسلمانوں کی معنوی، فکری، لسانی اور تہذیبی نسل کشی (Genocide) اور مختصر لفظوں میں (تاریخ داں حضرات کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ) اس ملک کو اسپین بنادینے کا ہمہ گیر منصوبہ تھا۔

لیکن وہ اپنی اس مخلصانہ، بے غرضانہ اور حقیقت پسندانہ کوشش میں کامیاب نہیں ہوا اور ان پارٹیوں نے اپنے الگ

الگ جھنڈے کے نیچے اپنی انتخابی معرکہ آزمائی کی مہم شروع کردی، اس خیال سے کہ انتخابات کی اس آندھی اور طوفان میں غیر جانبدارانہ رویہ اور اپنے کاموں کی مشغولیت کے ساتھ بیٹھنا مشکل ہوجائے گا، اس کے نام اور رجحان سے فائدہ اٹھایا جائے گا اور اس سے تعلق رکھنے والے شہریوں کی حمایت یا ترجیح حاصل کرکے انتخابات میں فائدہ اٹھایا جائے گا، اس کو کسی ایسے مقام پر چلا جانا چاہئے جہاں اس سے یہ کام نہ لیا جا سکے۔ (کاروان زندگی ج۵ص۳۰۵-۳۰۶)

ایک عزم کی ضرورت:

۱۹۹۸ء میں جب حکومت اتر پردیش نے اسکولوں میں وندے ماترم کو لازم قرار دیا، تو مولانا کی تڑپ نے ان کی زبان سے دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس میں وہ الفاظ و جملے ادا کرائے جو عزم و حوصلہ ہیں، جن میں دینی غیرت وحمیت کے ساتھ اصابت وصلابت ہے، جن میں تاریخ سے واقفیت ہی نہیں اس پر فخر بجا اور صحیح وقت پر اس سے استدلال ہے، جن میں تحریک ہے، حرکت وقوت ہے، یہ جملے ایک عزم کے ساتھ مستقبل کے لئے اس ملک میں رہنے والوں کو ایک طاقت ور لائحہ عمل فراہم کرتے ہیں، مولانا نے ایک اخبار کی رپورٹ اپنی خودنوشت میں نقل کی ہے، اسی کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

''مولانا علی میاں نے کونسل کے ارکان سے کہا کہ وہ ملک میں طوفانی دورہ کریں، ایک زلزلہ پیدا کردیں اور بیداری پیدا کریں بے شک اپنا کام عزم کے ساتھ اور مثبت انداز میں کریں، منفی انداز میں نہیں، نہ مخالفت کے جذبہ کو پیدا کرنے والے انداز میں'' (کاروان زندگی ج۷ص۶۷)

بالغ سیاسی شعور

مولانا ایک عظیم مفکر اور مخلص داعی تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے کے مالہ وما علیہ سے واقف ہونا چاہتے تھے، مولانا نے حقائق سے چشم پوشی اور حالات سے اعراض کی کبھی کوشش ہی نہیں کی بلکہ ''کاروان زندگی'' میں لکھتے ہیں:۔

''اس لئے واقعات ومشاہدات سے سرسری طور پر گذر جانا اور حقائق کو نظر انداز کرنا نہ مصنف کے لئے ممکن ہے اور نہ اس کی ایک محبّ وطن، صاحب ایمان اور بہی خواہ انسانیت کے لئے کوئی جواز یا گنجائش ہے'' (کاروان زندگی ج۶۔ ص۱۴۲۔۱۴۳)

اسی لئے مولانا کی جہد مسلسل ہر پہلو سے آخری سانس تک جاری رہی، ہندوستانی مسلمانوں کا ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے جہاں ملی بحران اور نقائص اور اخلاقی امراض کی طرف اشارہ کیا ہے وہیں یہ بھی لکھا:۔

''اس سب کے ساتھ مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ کوئی مذہب وملت کسی ایسے آزاد ملک میں جہاں اکثریت نہ صرف یہ کہ غیر مسلم ہو بلکہ اس میں (جیسا کہ بیان کیا گیا) احیائیت اور ملک کی پوری آبادی کو اپنی تہذیب وثقافت اور اپنی تاریخ کے زیر اثر لانے کی منظّم کوشش پائی جاتی ہو، بغیر بالغ سیاسی شعور اور اپنے لئے بلکہ ملک کے لئے مفید ومضر عناصر وتحریکات میں فرق وامتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت اور نادانی سے کسی مضر تحریک یا جماعت کا آلۂ کار بننے سے احتراز واحتیاط کے بغیر آزادی وعزت اور اپنے ملی تشخص اور دینی تحفظ کے ساتھ زندہ اور باقی رہنا ممکن نہیں'' (کاروان زندگی۔ج۶ص۱۵۲)۔

(..... **جاری**)

☆☆☆

آخری صفحہ

سلام اس پر کہ جس نے عورتوں کی دستگیری کی

(م۔ق۔ن)

ایک بار حضور اقدس ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مصروف کلام تھے، کسی نجی مسئلے پر گفتگو تھی لے ذرا بڑھ گئی، جذبات ذرا تلخ ہو گئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ میں ترشی تھی، اور لہجہ بھی بلند تھا، میاں بیوی میں ابھی یہ کارزار گرم تھا کہ حضرت عائشہؓ کے والد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آ نکلے، وہ ادھر سرکار دو عالم ﷺ کے جانثار تھے تو ادھر حبیبۂ رسول ﷺ کے پدر بزرگوار بھی، گویا دو چند ذمہ داری حضرت صدیقؓ نے محسوس کی اور باپ اپنی بیٹی کی سرزنش کے لیے طیش میں آگے بڑھے اور گرجے۔

''ہائیں''! تو رسول اللہ ﷺ کے سامنے آواز اونچی کرتی ہے!'' اور ادھر ہاتھ بھی بلند کر دیا۔ مگر بیٹی اپنے باپ کی سرزنش سے صاف بچ نکلی۔ کس نے بچالیا؟ حقوق نسواں کے مبلغ بیچ میں حائل ہو گئے۔

سلام اس پر کہ جس نے عورتوں کی دستگیری کی۔

جناب صدیق اکبرؓ کے غضب کا پارہ کتنی ہی بلندی پر نہ چڑھ گیا ہو، جس فعل میں ان کے رفیق وحبیب ﷺ حائل ہوں اس کی تکمیل کی انہیں جرأت کب ہو سکتی تھی؟

غضب پر ادب غالب آیا اور صدیقؓ والا مقام لوٹ گئے۔

اس واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کا عام برتاؤ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ نہایت شفقت، درگزر اور بے تکلفی کا تھا، اور صنف نازک کے جذبات کا بھرپور خیال رکھتے اور اس کی رعایت کرتے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ لکھتے ہیں: ''آپ کو صنف نازک کا جو احترام، اس کے جذبات اور لطیف احساسات کا شعور اور ان کا لحاظ تھا، وہ طبقۂ نسواں کے بڑے بڑے وکیل اور عورت کے احترام کے بڑے بڑے مدعی کے یہاں نہیں ملتا، اسی طرح وہ بڑے بڑے مقدس لوگوں، رشیوں منیوں یہاں تک کہ دوسرے پیغمبروں کی زندگی میں ملنا مشکل ہے، ازواج مطہرات کی دلجوئی ان کی جائز تفریحات میں شرکت، ان کے جذبات کا خیال اور ان کے درمیان جو عدل فرماتے اس کی نظیر نہیں ملتی'' (اسلام میں عورت کا درجہ)۔

لاکھوں بلکہ اربوں درود و سلام ہوں اس ذات عالی مقام نبی امی رسول عربی ﷺ پر جن کی مقدس اور بابرکت تعلیم کے ذریعہ مظلوم اور باعث ننگ و عار ہستی کو انصاف اور عروج نصیب ہوا، وہ طبقہ نسواں جس کی اپنی کوئی مرضی تھی نہ خواہش وہ ہر موڑ پر دوسروں کی محتاج اور دست نگر تھی، ظلم و جور کی چکی میں پستی تھی، آپ ﷺ نے اس کو عزت و وقار کے بامِ عروج پر پہنچایا۔

ماں، بیٹی، بیوی، بہن ہر حیثیت سے اس بے مایہ کو حقوق و اختیارات عطا فرمائے، اور صرف آپ نے اپنی زبان بلکہ اپنی دنیا تک کے لیے اعلیٰ اخلاق و کردار کے ذریعہ اس کی رعایت، خصوصی توجہ و عنایات اور پاس و لحاظ کے بیش بہا نمونے بھی چھوڑے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی ان اخلاق و کردار کو طبقۂ نسواں کے ساتھ برتنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

☆☆☆